ماہنامہ

جلد: ۹۳ | رمضان-شوال ۱۴۳۰ھ مطابق ستمبر-اکتوبر ۲۰۰۹ء | شمارہ: ۹ - ۱۰

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۰۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حبیب الرحمٰن اعظمی

دارالعلوم دیوبند ایک تعلیمی دینی ادارہ ہے جو لگ بھگ ڈیڑھ صدی سے انتہائی اخلاص اور جانسوزی سے اسلامی علوم وثقافت کی تعلیم وترویج میں مصروف عمل ہے، جس کے نفع بخش ثمرات کے نتیجہ میں رجالِ کار کی ایسی عظیم باکمال جماعت منصۂ شہود میں نمایاں ہوئی جس کی ہمہ جہت عالمگیر خدمات نے چہار دانگ عالم میں دارالعلوم کے نام وکام کو روشن کردیا اور آج دارالعلوم عالم اسلام ہی کا نہیں بلکہ ساری متمدن ومہذب دنیا کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور عقیدت کا مرکز بنا ہوا ہے، ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ غرضیکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ملے گا جہاں دارالعلوم کے شناسا اور عقیدت کیش نہ ہوں۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ خدمات کا ایک سنہری باب یہ بھی ہے کہ اس نے ''الدین الخالص'' کی سرحدوں کی نگہبانی اور حفاظت کا فریضہ بڑی چابک دستی اور پامردی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اسلامی آثار وروایات کے خلاف جب بھی کسی فتنہ نے سر اٹھایا تو دارالعلوم کے ساختہ وپرداختہ علماء نے علم وحکمت کے ہاتھوں اس کو کچل دیا، اور دین اسلام کو خارجی اثرات کی دخل اندازیوں سے محفوظ رکھا۔

علاوہ ازیں علم ودین سے وابستہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر وابناء نے وطن عزیز کو سامراج کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے اور ملک کی پیشانی سے داغِ غلامی کو مٹانے کے لئے ایثار وقربانی کی ایک ایسی عظیم تاریخ رقم کی ہے جس کے تذکرہ کے بغیر جنگِ حریت کی داستان مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ جذبۂ حریت سے سرشار علماء وفضلاء کی یہی وہ حوصلہ مند جماعت ہے جس

نے سب سے پہلے مکمل انقلاب اور آزادیٔ کامل کا نعرہ بلند کیا، اور تاریخ گواہ ہے کہ ان کے اس جذبہ کی تپش کو مالٹا کی برفیلی فضائیں اور کالے پانی کی مرطوب ہوائیں بھی سرد نہیں کرسکیں۔ قید وبند، جبر وتشدد، ظلم وجارحیت اور خانماں بربادی وغیرہ سے بے نیاز ہوکر اپنے متعین ہدف کے لئے سرگرم عمل رہے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک کہ ملک آزاد نہیں ہوگیا۔

علمائے دیوبند کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہے کہ ایک ایسا ملک جہاں بھانت بھانت کی زبانیں بولی جاتی ہیں، جس کی کھلی اور وسیع فضاؤں میں ان گنت تہذیبیں سانس لے رہی ہیں، جس میں مختلف مذاہب سے متعلق لوگ دوش بدوش زندگی کے مراحل طے کررہے ہیں، وہاں وہی نظام حکومت ملک اور اہل ملک کے لئے مفید اور بارآور ہوسکتا ہے جو جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادوں پر قائم ہو، کہ حکومت بحیثیت حکومت کے کسی مذہب سے نفیاً واثباتاً دلچسپی نہیں لے گی بلکہ ہر مذہب کے ماننے والے امن عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود اپنے مذہب کے تحفظ وفروغ کے ذمہ دار ہوں گے، اس لئے انھوں نے ہر قسم کی مخالف آواز کو نظر انداز کرکے آزاد ہندوستان میں دستوری اعتبار سے رائج سیکولر اور جمہوری نظام حکومت ہی کو ترجیح دیا اور مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر ہر قسم کی فرقہ پرستی کو مسترد کرکے ملک میں سیکولر اقدار کو استوار اور مستحکم کرنے میں پوری مستعدی سے کوشاں ہیں، اپنی اسی فکری ترجیح کی بناء پر مجموعی طور پر ہمیشہ سے ان کی وابستگی ملک کی انھیں سیاسی پارٹیوں سے رہی ہے جو اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں اور اسی حیثیت سے وہ ملک میں معروف اور جانی پہچانی جاتی ہیں۔

فرقہ پرستی اور اس کے نتیجہ میں دوسروں پر ظلم وزیادتی، جارحیت ودہشت گردی وغیرہ سے نفرت وبیزاری ان کا عام شیوہ ہے، اسی لئے بغیر کسی تفریق کے فرقہ پرست افراد، جماعت، تنظیموں اور پارٹیوں سے ان کا کبھی کوئی تعلق اور رشتہ نہیں رہا ہے، ان کے فکر وعمل کا یہ اعتدال عالم آشکارا ہے، جس کا اظہار وہ حسب موقع وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں وتحریروں کے ذریعہ کرتے بھی رہتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ مدارس وعلماء کا یہی علمی، دینی، سیاسی کردار دین بیزار اور فرقہ پرست عناصر کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے، وہ اپنی بددینی اور فرقہ پرستی کے پھیلانے

میں سب سے بڑی رکاوٹ دارالعلوم دیوبند کو باور کرتے ہیں، اس لئے دارالعلوم کا نام سنتے ہی ان پر جنون طاری ہوجاتا ہے اور اس عالم جنون میں ایسی باتیں کہہ جاتے اور ایسے کام کرگزرتے ہیں جن کا ہوش وخرد اور انسانی قدروں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند چونکہ رواداری اور سیکولر طاقتوں کا حلیف اور شریک کار رہے، جس طرح یہ سیکولر طاقتیں دارالعلوم دیوبند اور اس کے علما وفضلاء سے خیر وتعاون کی امید رکھتی ہیں اسی طرح دارالعلوم کے ارباب حل وعقد بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وقت پڑنے پر یہ حلیف طاقتیں اپنا دستِ تعاون بڑھائیں گی، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ فرقہ پرست اور جنونی عناصر دارالعلوم کی عزت وناموس پر پیہم حملہ کرتے رہتے ہیں اور ہمارے یہ حلیف خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات ہماری سیکولر حکومتیں نہ جانے کن ذہنی تحفظات کی بناء پر ان جنونیوں کو ایسے مواقع فراہم کردیتی ہیں کہ وہ دارالعلوم کی عظمتوں سے اپنا سر ٹکرائیں، سیکولر طاقتوں کے اس رویہ سے دارالعلوم دیوبند سے زیادہ خود سیکولر اقدار کو نقصان پہنچ رہا ہے جسے سیکولر حامیوں کو محسوس کرنا چاہئے۔

گو ترے ستم نے ہر اک طرح ہمیں ناامید بنادیا
یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کرکے دکھا دیا

بدیہیات قرآن

حکمتیں اور فائدے

از: محمد عارف جمیل مبارک پوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

فرمان باری ہے: واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلك الحرث والنسل واللّٰہ لا یُحبہ الفساد [بقرہ:۲۰۵]

”اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے، اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں، اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو“۔

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اوّل: ”سعی“ کے حقیقی معنی: تیزی کے ساتھ پاؤں سے چلنا۔ اور ظاہر ہے اس لحاظ سے سعی زمین میں ہی ہوگی پھر (فی الارض) کے ذریعہ اس کی وضاحت کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے عموم معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے، فساد کی سعی کرتا ہے۔ اور لفظ (فی الارض) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کے مختلف اطراف میں بہت زیادہ نقل وحرکت کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب (الارض) کو عام رکھا ہے، تو اس سے کثرت سعی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح کا مضمون اس سے پہلے، (لا تفسدوا فی الارض) [بقرہ:۱۱] میں آچکا ہے۔ یہ جواب ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱)

مقام دوم: فساد پیدا کرنا ایک عام لفظ ہے، جس کے تحت کھیتیاں اور جان تباہ کرنا داخل ہے، پھر اس کو الگ سے بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

اول: اللہ تعالیٰ نے فساد انگیزی کو اولا (لیفسد فیھا) کے ذریعہ اجمالی طور پر بیان فرمایا پھر

(ویهلك الحرث والنسل) میں اس کی تفصیل بیان فرمائی۔اس کی نظیر یہ آیت کریمہ من کان عدوا للّٰه، وملائکته ورسله وجبریل ومیکال. [بقرہ:۹۸]

''اور جو کوئی ہو دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل ومیکائیل کا۔''

فساد انگیزی کی ان دو شکلوں کو خاص طور پر اس لیے بیان فرمایا کہ دنیا کی آبادکاری میں ان دو چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔اس لیے ان دونوں کو تباہ کرنا، حد درجہ کی فساد انگیزی ہے۔یہ جواب رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۲)

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ فساد انگیزی کے معنی، تخریب کاری لی جائے لیکن اگر فساد انگیزی کا معنی یہ لیا جائے کہ یہ شخص جب مجلس نبوی سے واپس ہوتا تو اس کا کام ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرے، اور کفر کی تائید کے راستے نکالے۔اور اس کو بھی فساد انگیزی کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی بات نقل کرتے ہوئے فرمایا:

أتذر موسی وقومه لیفسدوا فی الارض [اعراف:۱۲۷]

یوں چھوڑتا ہے تو موسیٰ اور اس کی قوم کو کہ دھوم مچائیں ملک میں اور موقوف کردے تجھ کو اور تیرے بتوں کو۔

نیز فرمایا:

إني اخاف ان یبدل دینکم أو أن یظهر في الأرض الفساد.

''میں ڈرتا ہوں کہ بگاڑ دے تمہارا دین یا پھیلائے ملک میں خرابی''۔

اور اسی طرح کی توجیہ اس فرمان باری میں آچکی ہے:

واذا قیل لهم لا تفسدوا فی الارض [بقرہ:۱۱]

''اور جب کہا جاتا ان سے، فساد نہ ڈالو ملک میں''۔

اس صورت حال کو ''زمین میں فساد انگیزی'' سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف جنم لیتے ہیں، ان کا شیرازہ بکھرتا ہے، اور ہر ایک دوسرے سے اظہار برأت کرتا ہے، پھر قطع رحمی اور خوں ریزی ہوتی ہے۔فرمان باری ہے:

فهل عسیتم ان تولیتم أن تفسدوا فی الارض، وتقطعوا أرحامکم [سورہ محمد:۲۲]

''پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے، تو خرابی ڈالو ملک میں اور

قطع کروا پنی قرابتیں“۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے خبردار کردیا ہے کہ اگر یہ لوگ دین سے اعراض کریں گے تو زمین میں فسادانگیزی اور قطع رحمی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور یہ اسلوب قرآن میں (جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں) بہ کثرت موجود ہے۔

فسادانگیزی کو، تخریب کاری اور لوٹ مار کے مقابلہ، اس معنی پر محمول کرنا بہتر ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے، اس کو حرف عطف (واو) کے ذریعہ بیان فرمایا ہے، اور معطوف، معطوف علیہ سے، لازماً الگ ہوتا ہے۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۳)

دوم: فسادانگیزی سے مراد، شبہ ڈالنا ہے۔ جس طرح دینِ حق، دو امور سے عبارت ہے: علم اور عمل۔ اسی طرح دینِ باطل دو امور سے عبارت ہے: شبہات اور غلط کام کرنا۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے بارے میں اولاً یہ بیان فرمایا کہ یہ شبہات پیدا کرنے میں لگتا ہے، اور (لیفسد فیھا) سے یہی مراد ہے، اس کے بعد یہ بتایا کہ یہ شخص غلط کار ہے۔ اور (ویھلك الحرث والنسل) سے یہی مراد ہے۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۴)

۲-فرمان باری: والمطلقات یتربصن بأنفسھن ثلاثة قروء [بقرہ:۲۲۸]

”اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک“۔

سوال یہ ہے کہ اگر یوں کہہ دیتے (یتربصن ثلاثة قروء) تو بھی کافی تھا، جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرمایا:

تربص أربعة أشھر [بقرہ:۲۲۶]

”مہلت ہے چار مہینے کی“۔

یہاں پر (بأنفسھن) کے ذریعہ تاکید لانے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

اول: (بأنفسھن) کے ذکر میں، عورتوں کو انتظار کرنے پر ورغلانا اور خوب ترغیب دینا ہے؛ اس لیے کہ یہ ایسی چیز ہے، جس سے ان کو اعراض ہوتا ہے، اس میں ان کو اس پر آمادہ کرنا ہے۔ کیوں کہ عورتوں کی طبیعت، مردوں کی طرف مائل ہوتی ہے، اس ٹکڑے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی اس رغبت کو لگام دیں، اور انتظار پر مجبور کریں۔ یہ جواب زمخشری، رازی، ابن عاشور، ابوسعود، آلوسی اور بیضاوی نے نقل کیا ہے۔(۵)

دوم: (بأنفسهن) کا تعلق، (یتربصن) سے ہے، اور اس صورت میں ظاہر یہ ہے کہ ''بار'' سببیت کی ہے۔ یعنی اپنے نفس کی وجہ سے۔ اور اس صورت میں (بأنفسهن) کا ذکر ضروری تھا؛ اس لیے کہ اگر یوں کہا جاتا: "یتربصن بهن" تو یہ ترکیب درست نہ ہوتی؛ کیوں کہ اس میں اسم متصل کی ضمیر کو رفع دینے والے فعل کو، ضمیر مجرور کی طرف، متعدی کرنا ہوتا، جیسے: (هن تمر بها) اور یہ ترکیب صحیح نہیں۔ یہ جواب ابوحیان نے ذکر کیا ہے۔(٦)

سوم: تاکید کے زائد ہے اور مطلب یہ ہے: (یتربصن أنفسهن) جیسے کہتے ہیں: جاء زید بنفسه، جاء زید بعینه یعنی نفسه وعینه ۔ یہ جواب ابوحیان اور ابن عاشور نے نقل کیا ہے۔ البتہ ابن عاشور نے صاحب ''المغنی'' کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اس کو دو وجوہات سے رد کیا ہے:

الف: باعتبار لفظ، اس وجہ سے کہ ضمیر متصل کی تاکید کا حق یہ ہے کہ ضمیر منفصل یا کسی اور فاصل کے ذکر کے بعد آئے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حرفِ عطف پر اکتفا کیا۔

ب: باعتبار معنی: اس وجہ سے کہ یہاں تاکید کا کوئی تقاضا نہیں، اس لیے کہ سامع کا ذہن اس طرف نہیں جاسکتا کہ اس امر کا مخاطب مبتدا یعنی "المطلقات" (جس کی ضمیر خبر میں موجود ہے) کے علاوہ کوئی اور ہے۔(٧)

اس اشکال کا جواب ابوحیان دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ اعتراض نہ ہو کہ یہاں پر تاکید جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ ضمیر مرفوع متصل (یعنی یتربصن میں جو نون نسوۃ ہے) کی تاکید کے باب سے ہوگیا اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی تاکید ضمیر منفصل کے ذریعہ لائی جاچکی ہے، اور ترکیب یوں ہو: یتربصن هن بأنفسهن. اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تاکید پر حرف ''بار'' کی وجہ سے جر آگیا، تو یہ تابع ہونے سے خارج ہوگئی۔ اور اس میں وہ علت مفقود ہوگئی، جس کی وجہ سے ضمیر مرفوع متصل کی تاکید محال تھی تا آں کہ ضمیر منفصل کے ذریعہ اس کی تاکید لائی جائے، اگر نفس وعین کے ذریعہ اس کی تاکید لانی ہو۔ اس جواز کی نظیر: أحسن بزید، و أجمل ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: وأجمل به ہے۔ "به" کو فاعل ہونے کے باوجود، حذف کردیا گیا۔ یہ اہل بصرہ کا مذہب ہے۔

نیز اس لیے کہ جب حرف جر ''بار'' کی وجہ سے اس پر جر آگیا تو صورت میں فاعل ہونے

سے خارج ہوگیا۔ اور ''فضلہ'' کی طرح ہوگیا۔ لہٰذا اس کا حذف کرنا جائز ہوگیا۔ مزید براں یہ کہ اخفش نے ''المسائل'' میں لکھا ہے کہ قاموا أنفسهم بلاتاکید جائز ہے۔

یہاں پر اس تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ یہ عورتیں خود اس مدت کا انتظار کریں گی، اس میں یہ احتمال ختم ہوگیا کہ کوئی اور ان کے ساتھ اس کام کو انجام دے گا۔ ان عورتوں کو ہی، اس انتظار کا حکم دیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس فعل کے، ان سے واقع ہونے کا زیادہ تقاضا ہے۔ لہٰذا اس کی تاکید کی ضرورت محسوس ہوئی؛ کیوں کہ عورتوں کی طبیعت میں، شادی اور مردوں کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اور جب اس کی تاکید لادی گئی، تو معلوم ہوگیا کہ یہ شدت سے مطلوب ہے۔ (۸)

۳- فرمان باری: واذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فأمسكوهن بمعروف أو سرحوهن بمعروف ولا تمسكوهن ضرارا لتعتدوا [بقرہ:۲۳۱]

''اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت تک تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے، یا چھوڑ دو ان کو بھلی طرح سے، اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لیے''۔

سوال یہ ہے کہ (فأمسكوهن بمعروف) اور (ولا تمسكوهن ضرارا) میں کوئی فرق نہیں؛ کیوں کہ کسی بات کا حکم دینا اس کی ضد سے روکنا ہے، لہٰذا اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟

اس اشکال کے دو جواب دیے گئے ہیں:

اول: (ولا تمسكوهن ضرار) یہ ٹکڑا، (فأمسكوهن بمعروف) کی تاکید کی طرح ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے، ستانے کے لیے عورتوں کو روکے رکھنے سے منع فرمایا۔ اور اس ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ (فأمسكوهن بمعروف) میں جو امر ہے اس کی تعمیل ایک بار دستور کے موافق رکھ لینے سے ہوجاتی ہے، یہی امر کا مدلول ہے، یہ ہمہ وقت کو شامل نہیں۔ اس کے بعد ''نہی'' آئی، جو تمام اوقات کو شامل ہے۔ اور اس میں اس غلط عادت پر تنبیہ ہے جو دورِ جاہلیت میں رائج تھی کہ طلاق کے بعد، رجوع کرلیتے، پھر طلاق دیتے پھر رجوع کرلیتے تاکہ عورت کو ستائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل بد سے، خصوصا منع فرمادیا تاکہ اس گھناؤنے عمل پر تنبیہ ہوجائے، جو عورتوں کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک ہے کہ اس طریقہ سے ان عورتوں کی عدت (جو مہینوں سے عدت گذارتی ہیں) نو ماہ تک طول پکڑ جاتی تھی۔ یہ جواب رازی، ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔ (۹)

دوم: ابن عاشور کہتے ہیں:

''(ولا تمسكوهن ضرارا) میں (فأمسكوهن بمعروف) کے مفہوم مخالف کی تصریح ہے، اس لیے کہ ''ضرار''، ''معروف'' کی ضد ہے۔ یہ مفہوم، امر سے سمجھ میں آرہا تھا اس کے باوجود عطف کے ذریعہ اس کے بیان کرنے کی وجہ، اس ضد کی حددرجہ برائی کو بیان کرنا کہ شوہر (جو دستور کے موافق رکھنے کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں) عموماً اسی کے مرتکب ہوتے ہیں، نیز اس میں تاکید بھی ہے، اوراس میں نکتہ یہ ہے کہ ایک مفہوم کو ذہن کے اندر دو مختلف طریقے (جن کا مقصد ایک ہے) سے راسخ کردیا جائے۔(۱۰)

ابن عاشور پہلے جواب سے مطمئن نہیں، وہ رقم طراز ہیں:

''فخرالدین رازی نے کہا کہ اس آیت میں ''امر'' پر، ضد کی شکل میں، ''نہی'' کا عطف کیا گیا ہے، اس میں نکتہ یہ ہے کہ ''نہی'' کے برخلاف ''امر'' تکرار کا متقاضی نہیں۔''

لیکن امر ونہی کے درمیان یہ تفریق مسلم نہیں، علمِ اصول کا یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، البتہ انھوں نے اس کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ لغوی لحاظ سے امر ونہی کے درمیان فرق ہے۔ تاہم اگر ہم یہ کہیں کہ جہاں کہیں، ''امساک'' میں ''معروف'' پایا جائے، وہاں ''ضرار'' کا وجود نہیں ہوگا۔ اور جہاں ''معروف'' معدوم ہوگا، ''ضرار'' کا وجود ہوگا۔ لہٰذا ''ضرار''، ''معروف'' کی نقیض کے مساوی ہوگیا۔ تو اس صورت میں ہم اس عطف میں نکتہ یہ قرار دے سکتے ہیں کہ یہ اثبات ونفی کے دو طریقوں سے، ''امساک بالمعروف'' کے حکم کی تاکید ہے، گویا یوں کہا گیا: لا تمسكوا الا بمعروف ۔جیسا کہ سموٴل کے اس شعر میں ہے:

تسيل على حد الظبات نفوسنا   وليس على غير الظبات تسيل

تلوار کی دھاروں پر ہماری جان جاتی ہے۔ تلوار کی دھاروں کے علاوہ کسی اور چیز پر ہماری جان نہیں جاتی۔(۱۱)

۴-فرمان باری: ولا جناح عليكم فيما عرضتم به من خطبة النساء أو أكننتم فى أنفسكم علم الله أنكم ستذكرونهن ولكن لا تواعدوهن سرا الا أن تقولوا قولا معروفا ولا تعزموا عقدة النكاح حتى يبلغ الكتاب أجله واعلموا أن الله يعلم ما فى أنفسكم فاحذروه واعلموا أن الله غفور حليم [بقرہ:۲۳۵]

”اور کچھ گناہ نہیں تم پر کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح ان عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں، اللہ کو معلوم ہے کہ البتہ ان عورتوں کا ذکر تم کروگے، لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر، مگر یہی کہ کہہ دو کوئی بات رواج شریعت کے موافق، اور نہ ارادہ کرو نکاح کا، یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت، مقررہ اپنی انتہا کو، اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے، جو کچھ تمہارے دل میں ہے، سو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے۔“

بدیہی بات ہے کہ اشارہ میں نکاح کا پیغام دینا، اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ دل کا میلان ہو اور زبان سے کچھ نہ کہے، اور جب اشارہ میں نکاح کا پیغام دینا پہلے مباح قرار دے دیا تو اب (أو أكننتم في أنفسكم) کا جملہ ایک واضح امر کی وضاحت کے درجہ میں ہوگیا۔

اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

اول: امام رازی لکھتے ہیں:

”آیت کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے سمجھا؛ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فی الحال ”تعریض“ (اشارہ میں کہنا) کو مباح اور ”تصریح“ (صراحتاً اظہار کرنا) حرام قرار دیا، اس کے بعد فرمایا (أو أكننتم) اور اس سے مراد یہ ہے کہ دل میں یہ عزم کرے کہ مستقبل میں اس کا اظہار صراحتاً کرے گا۔ پہلی آیت میں فی الحال تعریض کو مباح، اور تصریح کو حرام کرنا ہے، اور دوسری آیت میں اس امر کو مباح کیا ہے کہ دل میں یہ عزم رکھے کہ زمانہ عدت گذرنے کے بعد، اس کا صراحتاً اظہار کردے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ سبب بیان کیا جس کی وجہ سے اس کو مباح کیا ہے، اور فرمایا (علم الله أنكم ستذكرونهن) اس لیے کہ نکاح کے باب میں جب نفس میں شہوت پیدا ہوجاتی ہے، تو صاحبِ شہوت، عزم وتمنا سے بہ مشکل چھوٹ سکتا ہے، اور چوں کہ اس میلان قلبی کو دور کرنا، ایک شاق امر کی طرح ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے حرج کو اٹھادیا اور اس کو مباح کردیا۔“

یہ جواب ابوحیان نے بھی نقل کیا ہے۔ (۱۲)

دوم: ابن عاشور کہتے ہیں:

”گناہ نہ ہونے کے باب میں، تعریض پر (أو أكننتم في أنفسكم) کا عطف کرنے (حالاں کہ یہ بات عیاں ہے کہ تعریض، نفس میں عزم کے بعد ہی

ہوتی ہے، اور تعریض پر گناہ نہ ہونے کا لازمی مطلب ہے کہ محض نفس کے عزم پر گناہ نہیں ہوگا) فائدہ یہ تنبیہ ہے کہ عزم ایسی چیز ہے جس کو دور نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اس کو ممنوع کیا جاسکتا ہے، اور جب یہ واقعہ اور صاحبِ عزم کا اپنے عزم کو زبان پر لانا ایک انسانی فطرت ہے کہ انسان اس کو چھپائے نہیں رکھ سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے مقام رخصت کو بیان فرمادیا کہ یہ انسانوں پر، اللہ کے رحم وکرم کا ایک مظہر ہے، نیز اس میں حالتِ عدت کے احترام کو بھی ملحوظ رکھا، اور اس رخصت کی علت بھی بیان فرمادی کہ اس کا سبب، نفی حرج ہے۔ یہ اس تشریع کی حکمت ہے جو اس سے پہلے ان کے سامنے بیان نہیں ہوئی تھی۔''

یہ جواب ابوحیان نے بھی نقل کیا ہے۔ (۱۳)

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۲) رازی ۵/۲۱۷؛ ابوحیان ۲/۲۲۹۔
(۳) رازی ۵/۲۴۶۔
(۴) رازی ۵/۲۴۶۔
(۵) زمخشری تفسیر آیت، رازی ۴/۴۳۴؛ ابن عاشور تفسیر آیت، ابوسعود ۱/۲۲۶؛ آلوسی ۲/۱۳۰؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ بیضاوی ۱/۵۱۳۔
(۶) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۷) ابوحیان تفسیر آیت؛ ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۸) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۹) رازی ۶/۴۵۳؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ ابوسعود ۱/۲۳۰؛ آلوسی ۲/۱۴۴۔
(۱۰) ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۱۱) ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۱۲) رازی ۶/۴۶۹؛ ابوحیان ۲/۵۲۱۔
(۱۳) ابن عاشور تفسیر آیت؛ ابوحیان تفسیر آیت۔

اسلامی تقویم کا آغاز اور اسلام میں محرم کی اہمیت وتعزیہ داری کی حرمت وتاریخ

از: ضیاء الدین قاسمی ندوی خیرآبادی

اسلامی تقویم کا آغاز محرم الحرام سے ہوتا ہے جو کہ اسی فطری نظام کائنات کے تحت جیسا کہ خالق کائنات نے مقرر فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے!

اِنَّ عدة الشهور عند الله اثنیٰ عشر شهرا فی کتاب الله یوم حلق السمٰوات والأرض منها اربعة حُرمٌ ذلك الدین القیم (سورہ توبہ)

یقیناً مہینوں کی تعداد تو اللہ کے نزدیک بارہ ہے اللہ کی کتاب (لوح محفوظ) میں جس دن کہ پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں یہی سیدھا درست دین ہے۔

ان بارہ مہینوں کی ترتیب محرم سے شروع ہوکر ذی الحجہ پر ختم ہوتی تھی اور چار مہینے محرم، رجب، ذیقعدہ اور ذی الحجہ اشہر حرم تھے جن میں قتل وقتال جائز نہیں تھا۔ اہلِ عرب ان چاروں مہینوں کی حرمت کا لحاظ و پاس کرتے تھے حالانکہ ریگستان عرب کے بدووں اور بادیہ نشیں قبائل کی معیشت وزندگی کا دارومدار عام طور پر لوٹ مار پر تھا قافلوں اور مسافروں کو لوٹنا ان کا مشغلہ تھا بلکہ روزی روٹی کے حصول کے لئے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر حملہ آور ہوتا رہتا تھا اسی وجہ سے عرب کی سرزمین پر خون خرابہ قتل وقتال اور غارت گری کا ایک چلن تھا جو قبیلہ زیادہ جنگجو ہوتا تھا اس کی عظمت وشوکت تسلیم کی جاتی تھی مگر یہ تمام خون خرابے لوٹ پاٹ اشہر حرم میں موقوف کردیئے جاتے تھے۔

اہلِ عرب اگرچہ چار کے عدد کا لحاظ کرتے تھے مگر قدرتی ترتیب کا پاس نہیں کرتے تھے چونکہ ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم تین مہینے پے درپے حرمت والے ممنوع القتال پڑتے تھے اس سہ ماہی وقفہ میں اکثر ان کے خورد ونوش کا سامان ختم ہوجاتا تھا خاص کر صحرا وجنگل میں بسنے والے

منتشر بدوؤں کے قبائل جن کا پیشہ ہی لوٹ مار تھا پھر وہ قبائل عرب بھی پریشان رہتے تھے جن کی عادت ہی دوسرے قبیلوں سے جنگ تھی۔ لہٰذا ان سب نے یہ ترکیب نکالی کہ حرمت والے مہینوں میں تقدیم وتاخیر کرنے لگے محرم کو موخر کردیتے تھے اس سال پہلے صفر ہوگا اس کے بعد محرم کبھی ذی الحجہ وذیقعدہ وغیرہ کو ختم کرکے کوئی اور مہینہ بنادیتے تھے تاکہ لوٹ مار آسان وحلال ہوجائے اسی کو قرآن پاک نے اِنَّما النسیُٔ زیادۃٌ فی الکفر سے تعبیر کیا ہے۔

صاحب تفسیر جلالین انما النسیٔ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای التاخیرُ لحرمةِ شهرٍ الی آخر کما کانت الجاهلیة تفعله من تاخیر حرمة المحرم اذا اهل وهم فی القتال إلی صفر.

یعنی ایک مہینہ کی حرمت کو دوسرے مہینہ کی طرف موخر کردینا جیسا کہ دور جاہلیت کے لوگ محرم کی حرمت کو چاند دیکھنے کے صفر تک موخر کردیتے تھے اس وقت جب کہ وہ جنگ کررہے ہوتے تھے'' اور ابھی ختم کرنے کے موڈ میں نہیں ہوتے تھے۔''

اسی کو شرح المواہب کے مولف نے اپنی اس عبارت میں نقل کیا ہے:

ذلك اَنَّهم کانوا یستحلون القتال فی المحرم لطول مدة التحریم بتوالی ثلاثةِ اشهرٍ ثم یحرمون صفر مکانهٗ (از حاشیہ جلالین)

اس لئے کہ عرب والے محرم میں قتال کو حلال کرلیتے تھے۔ تحریم کی مدت کی طوالت کے پیش نظر پے درپے تین مہینوں کے آنے سے پھر اس کی جگہ صفر کو حرام کرلیتے تھے۔

اس تقدیم وتاخیر کے سبب ازل سے جو قدرتی ترتیب قائم چلی آرہی تھی بگڑ گئی تھی جس سال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع فرمایا تو آپ نے اپنے خطبہ میں پوچھا تھا کہ یہ کونسا دن اور کونسا مہینہ ہے صحابہ خاموش رہے کہ شاید کوئی تبدیلی کا اعلان ہوگا لیکن جب آنحضور نے کہا یہ یوم نحر نہیں تو صحابہ نے عرض کیا بے شک پھر آپ نے فرمایا کیا یہ ماہ ذی الحجہ نہیں ہے تو صحابہ نے عرض کیا بے شک اس کے بعد رسول خدا نے اپنا تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ

اِنَّ الزمان استدار کهیئة یوم خلق السمٰوات والأرض (خطبہ حجۃ الوداع، رواہ...)

یقیناً زمانہ گھوم پھر کر اسی فطری ترتیب پر آگیا ہے جیسا کہ اللہ نے آسمان وزمین کی تخلیق کے دن ہیئت وترتیب رکھی تھی۔

لہٰذا اسلام کے بعد قیامت تک یہی ترتیب رہے گی اور اسی ترتیب سے محرم الحرام اسلامی

کلینڈر کا پہلا مہینہ ہے اسی نئے سال کا ہم والہانہ استقبال کررہے ہیں یہ سال نو اللہ کرے کہ امت محمدیہ کی سربلندی اور دینی بیداری کا سال ہو۔

اسلامی کلینڈر کا آغاز ہجری سے کیوں

عیسوی شمسی سال کے برعکس اسلامی قمری سال کا آغاز ولادت النبی کے بجائے ہجرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنے میں زبردست حکمت ومصلحت ہے جب امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے اسلامی تقویم کا معاملہ آیا اور اسلامی سال شروع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے ہجرت کو معیار بنایا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مکی زندگی، تعذیب وتکلیف ابتلاء وآزمائش، نفرت وعداوت، تعصب ومنافرت سے دوچار ہونے مصائب وآلام، شدائد ومحن کا سامنے کرنے میں گذری ہے قدم قدم پر مخالفت ومعاندت ہوتی تھی، ظلم وستم اور جبر واستبداد کے پہاڑ توڑے جاتے تھے فتنہ انگیزیاں اور بہتان تراشیاں ہوتی تھیں، اسلام کے چراغ کو گل کرنے کی سازشیں، آفتاب رسالت کو معدوم کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے تیرہ سال تک جس قسم کے ہولناک مظالم کا سامنا فداکارانِ محمد اور مظلومانِ اسلام نے کیا اس کو پڑھ کر سن کر دل لرزنے لگتا ہے زندگی کیا تھی بس درندوں، وحشیوں کے درمیان انسانیت، شرافت، عزت پس رہی تھی جب قوت برداشت نہ رہی، پیمانہ صبر چھلکنے پر آمادہ تھا اور پائے استقامت میں تزلزل کا خطرہ پیدا ہوگیا تو اللہ رب العزت نے مکہ چھوڑ کر دوسرے شہر مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیدیا، اہلِ ایمان نے اللہ ورسول کے سرمایہ کو بچانے کیلئے دولت وثروت اور جاگیر وجائداد مادی سرمایہ جوش وشوق سے چھوڑنا گوارہ کرکے اپنی ایمانی صلابت اور اللہ ورسول سے سچی محبت کا ثبوت دیا ہجرت کے بعد مدنی زندگی شروع ہوتی ہے جو انصار مدینہ کی مہاجرین واسلام کی قدم قدم پر نصرت واعانت اور حق کیلئے ایثار وقربانی سے عبارت ہے دنیا نے مکہ میں اپنوں کی ستم ظرفیاں اور دشمنیاں دیکھی تھیں تو مدینہ میں غیروں کی محبتیں والفتیں بھی دیکھ رہے تھے۔ مکہ میں تکذیب وتضحیک تھی تو مدینہ میں تصدیق وتقریب بھی، مکہ میں نفرت وعداوت تھی تو مدینہ میں محبت واخوت تھی، مکہ میں بندش ورکاوٹ تھی تو مدینہ میں آزادی عمل اور حریت تبلیغ تھی۔ مکہ میں بائیکاٹ وقطع رحمی تھی تو مدینہ میں جوڑنا اور صلہ رحمی تھی۔ مکہ میں شعلہ باری تھی تو مدینہ میں گل پاشی تھی۔ مکہ سے اخراج تھا تو مدینہ میں والہانہ استقبال ہورہا تھا۔ گویا ہجرت النبی اسلام کی

نشر واشاعت اور دین کی دعوت وتبلیغ کا مرکز اولین تھا، مسلمانوں کے اتحاد وملت اور اتفاق امت کا محور تھا یہیں سے اسلام کی دعوت کا پرچم بلند ہونا شروع ہوا اور مسلمانوں میں شوکت کے دور کا آغاز ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سچے پکے مخلص اصحاب ملے جنھوں نے اپنی جانیں قربان کرکے بانی اسلام کی حفاظت فرمائی آپ کے ادنیٰ سے اشارے پر فخر وناز سے اپنی گردنیں کٹوائیں، آپ کی محبت میں اولاد واقارب کی محبت کو قربان کردیا پھر بھی کہا ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' اسی لئے تو آقا مدنی فداہ اَبی وامی ﷺ نے انصار مدینہ کی ناز برداری فرمائی ہے ان کے حق میں خیروبرکت کی دعائیں دیں اور خلفاء راشدین سے فرمایا ہے کہ انصار سے اگر کہیں لغزش بھی ہوجائے تو مواخذہ مت کرنا اس لئے کہ انھوں نے میری اور اسلام کی اس وقت مدد کی تھی جب کہ اپنوں نے نکالدیا تھا۔ آپ نے یہ تاریخی جملہ انصار کیلئے ارشاد فرمایا لولا الھجرۃ لکنتُ امرأ من الانصار (۱) الانصارُ شعارٌ والناسُ دثارٌ کہ اگر ہجرت مقدر نہ ہوتی تو میں انصار مدینہ کا ہی ایک فرد ہوتا۔ انصار شعار یعنی اصل میں اور تمام لوگ دثار یعنی وقتی ساتھ والے ہیں۔

یہی وہ حکمتیں ومصلحتیں ہیں جن کے باعث ہجرت کو معیار بنایا گیا کہ اس سے اسلامی عظمت کا آغاز ہوتا ہے اسلامی اتحاد کی ابتدا ہوتی ہے اور اسلامی اخوت ومساوات کی شروعات ہوتی ہے۔

ماہ محرم کی اہمیت وفضیلت

ماہ محرم الحرام کی تاریخی اہمیت مسلم ہے احادیث وروایات اور آثار سے اس کے فضائل و برکات ثابت ہیں روایات کی روشنی میں اسی محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی تخلیق فرمائی۔ یوم عاشوراء ہی کو جنت پیدا فرمائی۔ یوم عاشوراء ہی کو سفینہ نوح جودی پہاڑ پر ٹھہرا۔ یوم عاشوراء ہی کو حضرت موسیٰ اوران کی قوم نے فرعون سے نجات حاصل کی اور اللہ نے فرعون اوراس کے لشکر کو غرق کیا۔

یوم عاشوراء کا روزہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

(۱) الخطابۃ المعجزہ از مختارات، ج ا۔ شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو آدمی ہر دم پہنے رہتا ہے الگ نہیں کرتا اور دثار کے معنی چادر کے ہیں جو حسب ضرورت اوڑھ لی جاتی ہے پھر اتار کر رکھ دی جاتی ہے آپ ؐ نے تمثیل فرمائی ہے۔

رمضان کے بعد بہترین روزہ محرم کا روزہ ہے اور فرض نماز کے بعد بہترین نماز تہجد کی نماز ہے۔ (مسلم شریف، ریاض الصالحین)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم کی دسویں تاریخ کو خود بھی روزہ رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے (بخاری ومسلم)

ماہ محرم اور تاریخی حوادث

اگر ایک طرف محرم فضائل وبرکات کا مہینہ ہے تو اسی کے ساتھ اس مہینہ سے بہت سے دردناک تاریخی حوادث و واقعات وابستہ ہیں جن کی کربناکی سے امت مسلمہ کا ہر فرد بے چین ومضطرب ہوجاتا ہے اور تاریخ اسلام کا صفحہ محرم الحرام مظلومان کربلا کے لہو سے تربتر نظر آتا ہے اہل بیت کی اولوالعزمی سیدنا حسین سردارِ نوجوانان جنت کی ایمانی صلابت۔ حق گوئی وبے باکی۔ صبر وتحمل، عزیمت واستقامت کی داستان ہر مسلمان کو عزم وحوصلہ اور باطل کے سامنے سینہ سپر رہنے کی ہمت بخشتی ہے تو دوسری جانب یزیدی فوج کی سنگدلی، بے رحمی، بے حسی اور جبر واستبداد، خاندانِ رسول کی بے حرمتی، اہل بیت کی بے عزتی اور مظلومان کربلا کی تذلیل وتحقیر اور ان کو ناحق تہہ تیغ کرنے کی چنگیزی حرکات سے اسلام کی روشن تاریخ داغدار دکھائی دیتے ہے واقعہ کربلا میں دغابازی، بے وفائی اور غداری کی عبرت انگیز داستان بھی ہے کہ کس طرح آج شہادت حسین کے نام ماتم وغم منانے والے شیعہ حضرات نے سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو خطوط لکھ لکھ کر کوفہ بلایا تھا پھر مصیبت میں آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا حضرت مسلم اور ان کے دو صاحبزادوں کے خون سے اپنا ناپاک ہاتھ رنگنا غداری بے وفائی کی بہت ہی المناک گھناؤنی تاریخ ہے جس کے حرف حرف سے مکر وفریب کی بدبو پھیلتی ہے پھر بھی واقعہ کربلا اور شہادت حسین کو اہل رفض وتشیع نے اتنا بدل ڈالا ہے اور اپنے فاسد عقائد میں ایسا رنگ دیا ہے کہ سچائی ہزاروں پردوں میں چھپ گئی ہے۔ تعزیہ داری، ماتم اور مرثیہ خوانی نے غم حسین کو ایسا رنگ دیدیا ہے کہ محرم الحرام کا یہ واقعہ کرب والم، ایک جشن بنادیا گیا ہے من گھڑت واقعات کو اشعار میں بیان کرکے مرثیہ خوانی سے خانوادۂ رسالت اور اہل بیت کی نعوذ باللہ تحقیر ہوتی ہے کاشانہ نبوت اور حرم حسین کی پاکیزہ صفات پاک دامن عفت مآب خواتین کو سینہ کوبی اور آہ وبکا کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے نوحہ کرتے روتے بلکتے چاک گریباں کرتے اور بالوں کو نوچتے چلاتے دکھایا جاتا ہے سکینہ وزینب کو زیب داستان بنا کر

مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔

ان سے بڑھ کر مشرکانہ اعمال ہوتے ہیں حسین کی شبیہ بنائی جاتی ہے تعزیہ کے نام پر قبر بنا کر اس کا جلوس نکالا جاتا ہے اور ان سب حرکات کو اسلام کا نام دیا جاتا ہے بالکل وہی افعال واعمال شیعہ حضرات کی طرف سے ہوتے ہیں جس طرح دسہرہ و دیوالی کے مواقع پر برادران وطن ہندو لوگ اپنے دیوی دیوتا کی مورتیاں تیار کرکے جھانکی بناتے ہیں گشت کرتے ہیں پوجتے ہیں پھر دریا میں سیرا آتے ہیں یہی حال تعزیوں کا ہے کہ گشت کرتے ہیں ماتم کرتے ہیں تماشے ہوتے ہیں سینہ کوبی اور نوحہ خوانی ہوتی ہے میلہ سا لگتا ہے رنگ برنگے جھنڈے جھنڈیاں اور قسم قسم کی شکل وصورت بنائی جاتی ہے پھر مصنوعی کربلا کے گہرے کنویں میں دفن کر آتے ہیں۔

شہادت فاروق اعظم

میں نے واقعہ کربلاء کے تاریخی پس منظر میں جانے اور اس کی پرخار تاریخی وادی میں سفر کرانے کے بجائے صرف اصل بات کو سامنے رکھا ہے کیونکہ شیعی روایات نے واقعہ کربلا کو اتنا مسخ کردیا ہے کہ حقیقت سامنے لانے میں بہت ہی زیادہ تحقیقات اور ہزاروں صفحات کی ضرورت ہے۔شہادت حسین سے پہلے اسی ماہ محرم کی پہلی تاریخ کو امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا عظیم سانحہ پیش آیا، وہ عمر جن کی شہادت یقیناً واقعہ کربلا سے زیادہ دردناک ہے اسلئے کہ اسلام کو رفعت وعظمت کی بلندیوں تک پہنچانے والے عمر فاروق تھے جن کو برادر رسول اور مطلوب اسلام ہونے کا شرف حاصل ہے جن کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا تھا اور جن کی ذات میں خاتم النّبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو صفات نبوت نظر آتی ہیں کہ ارشاد ہوتا ہے:

لا نبی بعدی لو کان بعدی نبی لکان عمر (مشکوٰۃ مناقب عمر)

میرے بعد کوئی نبی نہیں اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو یقیناً عمر ہی نبی ہوتے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عنداللہ مقبولیت کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقریباً ۳۴ مواقع پر عمر کی عین خواہش کے مطابق آیت قرآن نازل فرمائی ہے جن کو موافقات عمر کہا جاتا ہے۔عمر کی عظمت کا سِکّہ مہاتما گاندھی کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ آزادی کے بعد گاندھی جی نے کانگریسی لیڈران سے کہا تھا کہ تم اسی صورت میں کامیاب حکمراں بن سکتے ہو جب کہ عمر کو اپنا آئیڈیل بناؤ گے۔(دیکھئے کتاب محمد، قرآن اور اسلام غیروں کی نظر میں)

نوحہ و ماتم اور تعزیہ سازی کی رسم کہاں سے اور کب سے؟

بات چل رہی تھی دس محرم تک شیعہ حضرات کی مختلف رسومات اور ماتم، نوحہ، تعزیہ وغیرہ کا جو شہادت حسین اور واقعہ کربلا کے پردہ میں ہورہا ہے تعزیہ سازی کی رسم کب سے اور کیسے شروع ہوئی اس سلسلہ میں مستند ترین شخصیت، فخرالمحدثین ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ نے جو تحقیق فرمائی ہے اس سے بہتر کوئی دوسری تاریخی روایات نہیں ملتیں حضرت محدث اعظمیؒ نے شیعوں کے ایک رسالہ ''عزاداری کی تاریخ اور اسکا اثبات سنی نقطۂ نظر'' کا جواب ابطال عزاداری کے نام سے دیا ہے جو دارالمبلغین کے ترجمان الداعی جلد ۶ بابت ماہ جمادی الآخر ۱۳۶۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ شیعہ مولف نے اپنے رسالہ ''عزاداری کی تاریخ'' کے بارے میں لکھا ہے کہ عزاداری کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ میں نے اپنے رسالہ میں اس نظریہ علماء اہل سنت کی کتابوں سے ثابت کیا ہے (میں اسی کو بنیاد بنارہا ہوں حضرت ابوالمآثر کی تحقیق لکھتا ہوں) شیعی مولف رسالہ نے لکھا ہے شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد عزاداری بمعنی گریہ و ماتم کی ابتداء یزید کے گھر سے ہوئی (ص ۵) ملا باقر مجلسی ایک زبردست شیعہ مجتہد و مصنف ہیں وہ اپنی کتاب جلاء العیون ص ۵۲۴ میں لکھتے ہیں:

جب اہل بیت حسین، یزید کے محل میں داخل ہوئے تو اہل بیت یزید نے زیور اتار کر لباس ماتم پہنا۔ صدائے نوحہ وگریہ بلند ہوئی اور یزید کے گھر میں تین روز تک ماتم رہا۔

اسی طرح ناسخ التواریخ ص ۲۷۸ اور منہج ص ۳۲۸ میں اس ماتم کا ذکر ہے۔

پھر شیعہ مولف رسالہ میں لکھتا ہے: حضرت حسین کی شہادت کے بعد تین سو برس تک عشرہ محرم میں رونے پیٹنے کی رسم کا کہیں وجود نہ تھا ۳۵۲ھ سب سے پہلے معزالدولہ ویلمی نے صرف دسویں محرم کو بغداد میں حضرت حسین کے ماتم کرنے کا حکم نافذ کیا اور اس کے بعد ۳۶۳ھ میں المعزلدین اللہ فاطمی نے مصر میں بھی حکم جاری کیا۔ ص ۱۰-۱۱۔

ہندوستان میں چھٹی صدی ہجری تک گریہ ماتم کا کہیں وجود نہیں ملتا۔

ہندوستان کے سوا دنیا میں کہیں بھی تعزیے نہیں بنتے اور ہندوستان میں بھی آٹھویں صدی تک اسکا کوئی نشان نہیں ملتا۔ (ص ۳۰-۳۱)

یہ تمام عبارتیں شیعہ مولف کے رسالہ کی ہیں جس کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے کہ یہ اہل

سنت علماء کی کتابوں سے اخذ ہیں۔

ابوالماثر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: معزالدولۃ ویلمی نہایت غالی شیعہ بلکہ تبرائی رافضی تھا اورالمعزلدین اللہ فاطمی ایک مجوسی النسل بے دین رافضی تھا۔جس رسم کی بنیاد یزید نے ڈالی ہواور معزالدولہ والمعز نے اس کوترقی دی ہوظاہر ہے کہ ایک غیرت مند سنی کواس سے جس قدر نفرت ہوگی کم ہے یہی وجہ ہے کہ مصروشام، ایران وافغانستان وغیرہ یہ رسم صرف شیعہ ادا کرتے ہیں جیسا کہ شیعہ مولف نے ص:۱۹ میں خود تسلیم کیا ہے ''مصروایران وغیرہ میں عزائے حسین صرف شیعان علی سے مخصوص ہے''۔

ابوالماثر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ہمایوں کے زمانہ میں بھی ماتم کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں لیکن اگر ہوتا رہا ہواس کی وجہ بھی صرف یہی ہوسکتی ہے کہ اس وقت ایرانی شیعہ ہندوستان میں آکرآباد ہوگئے ایرانیوں کی امداد کی وجہ سے ہمایوں بھی ان شیعوں کی دلدہی کرتا تھا چنانچہ شیعہ مولف کے رسالہ میں بھی اس کے اشارات پائے جاتے ہیں دیکھو،ص:۳۵۔

بہرحال اب تک تھوڑی بہت جہاں یہ رسم ہوتی تھی صرف شیعوں کے ساتھ مخصوص تھی سنیوں کی شرکت کا کوئی ثبوت نہیں ہے ہاں جب وہ زمانہ آیا جب بقول مولف تمام اطراف ہند میں شیعہ حکمراں تھے اس وقت ان کے حکمرانوں نے حکومت کے زور سے تعزیہ داری و ماتم کی ترویج کی اور سنیوں کو بجبر واکراہ تعزیہ دار بنایا جیسا کہ ص ۳۸ و۳۹ کی عبارت اس کی غمازی کررہی ہے۔

تعزیہ سازی کا آغاز

یہ تو ابھی صرف گریہ و ماتم اور نوحہ وزاری کی تاریخ ہے ابھی تعزیہ داری کو لیجئے تو یہ ایک ایسی بدعت ہے کہ ہندوستان کے سوا کسی جگہ کسی عہد میں اس کا نام ونشان نہیں پایا جاتا اور ہندوستان میں بھی خود مولف کے بیان کے مطابق قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے زمانہ تک (یعنی نویں صدی ہجری تک (اس کا پتہ نہیں چلتا، تاریخیں، سفرنامے اور دوسرے مظان کل کے کل خاموش ہیں تیمورلنگ کواس کا موجد قرار دینا عامیانہ روایت پر مبنی ہے مولف خود تصریح کرتا ہے کہ اس کا تاریخی ثبوت اب تک فراہم نہیں کیا جاسکا ہے (ص ۴۱ رسالہ عزاداری کی تاریخ)۔

بہرحال عالمگیر کے زمانے سے پہلے تعزیہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور عالمگیر کے عہد میں صرف ایک تابوت بنانے کا ذکر جن صاحب نے لکھا ہے وہ غالی شیعہ تھے جیسا کہ مولف نے خود ہی لکھا

ہے دیکھو ص ۳۳و۳۹ عزاداری کی تاریخ۔

مضمون کے آخر میں محدث اعظمی ابوالمآثر رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

ناظرین غور فرمائیں کہ شیعہ مولف نے ماتم وتعزیہ کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں آتا لیکن رسالہ کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ ''یہ رسوم فرقۂ اہلسنّت سے زیادہ وابستہ ہیں'' یہیں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کے مذہب میں سچائی کی کتنی قدر و قیمت ہے۔

تعزیہ داری حرام ہے

حضرت مولانا عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تعزیہ داری در عشرۂ محرم وساختن ضرائح وصورت وغیرہ درست نیست زیرا کہ تعزیہ داری عبارت ازیں ست کہ ترک لذائذ وترک زینت کند وصورت محزون وغمگیں نمایند یعنی مانند صورت زناں سوگ دارندہ بنشیند ومرد را ہیچ ازیں قسم در شرع ثابت نشود (فتاویٰ عزیزی ص ۷۲ مطبوعہ دہلی)

(عشرۂ محرم میں تعزیہ داری اور تعزیے یا قبروں کی صورت بنانا جائز نہیں ہے اس لئے کہ تعزیہ نام ہے اس بات کا کہ لذیذ چیزوں اور زینت کو ترک کردے اور شکل وصورت غمگین ومحزون بنائے یعنی سوگ والی عورتوں کی طرح بیٹھے، مرد کو یہ بات کسی موقع پر شریعت سے ثابت نہیں ہے۔)

تعزیہ داروں کی مجلس میں حاضر ہونا جائز نہیں

دراں مجلس بہ نیت زیارت وگریہ زاری حاضر شدن ہم جائز نیست زیرا کہ آنجا زیارت نیست کہ جائے او حاضر شود ایں چوبہا کہ ساختۂ او ہستند قابل زیارت نیستند بلکہ قابل ازالہ اند چنانچہ در حدیث شریف آوردہ مَنْ رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہٖ فان لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الایمان (رواہ مسلم) ودر مجلس تعزیہ داری رفتہ ومرثیہ وکتاب شنید اگر در مرثیہ وکتاب احوال واقعی نیست بلکہ کذب وافترا وتحقیر بزرگاں درذکر پس شنیدن ایں چنیں مرثیہ وکتاب بلکہ دریں قسم مجلس حاضر شدن ہم روا نیست (فتاویٰ عزیزی ص ۷۳ مطبوعہ دہلی)

(اس مجلس میں گریہ وزاری کی نیت سے جانا کبھی جائز نہیں ہے اسلئے کہ وہاں زیارت کی چیز نہیں ہے کہ اسکے لئے حاضر ہو یہ لکڑیاں جو اسی کی بنائی ہوئی ہیں زیارت کے قابل نہیں ہیں بلکہ مٹانے کے قابل ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جو شخص کوئی غیر شرعی چیز دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے، اور تعزیہ داری کی مجلس میں مرثیہ وکتاب سننا تو اگر مرثیہ وکتاب میں واقعی حالات نہ ہوں بلکہ کذب وافتراء اور بزرگوں کی تحقیر ہو تو ایسا مرثیہ وکتاب سننا بھی جائز نہیں ہے)۔

یہ ایک تلخ حقیقت اور مشاہدہ ہے کہ ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں سنیوں کی آج ایک بہت بڑی تعداد تعزیہ داری اور سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کی مشرکانہ رسم میں مبتلاء ہے اور بہت فخر سے خود کو اہل سنت والجماعت کے لقب سے یاد کرتی ہے اللہ ان کو ہدایت دے نیز تعزیہ داری کے جلوس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد تماشہ بین کی حیثیت سے موجود ہوتی ہے جبکہ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

جب زمین پھٹتی ہے آتا ہے سمندر میں اُبال.....!

از: عزیز بلگامی

اس زمین اور اِس پر موجود ہر شے کی بناوٹ کو جس زاویۂ نگاہ سے اور جتنی بار بھی دیکھیے، ہر بار حیرت انگیز انکشافات کی ایک قطار لگ جائے گی، جو یہ سوچنے پر مجبور کردے گی کہ آخر اِن تخلیق کاریوں کا مالک کیسا خلاق العلیم ہے کہ جس کے دستِ قدرت نے اِنہیں نہ صرف لباسِ حیات پہنایا ہے بلکہ ہر تخلیق کے لیے نقشہ بھی بڑا اعمدہ رکھا ہے اور اُس کی ساخت بھی کاملیت کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے، سولھویں سورۃ کی پندرھویں تا اٹھارویں آیات میں ہے: ''اور زمین میں پہاڑ جمادیے کہ وہ تمہارا بیلنس بنائے رکھے۔ پھر یہ کہ اس میں نہریں جاری کردیں، پھر راستے بنادئے، تاکہ تم راہ پاسکو اور (اِسی طرح) ستاروں سے بھی وہ علاماتِ سمت پاکر رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ پھر کیا جو خالق ہے، اس کے جیسا ہوسکتا ہے، جس نے کبھی کچھ بھی پیدا نہ کیا ہو؟ کیا تم سوچتے نہیں! اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو کبھی نہ گن سکو گے، بے شک اللہ غفورالرحیم ہے۔''

وہ اپنی تخلیقات کا ایک ایسا زبردست پروگرامر ہے جس میں کسی عیب یا خطا کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیوں کہ ہر شے کے ذمہّ اُس نے کچھ کام بھی مختص کررکھے ہیں جن سے یک سرِ موانحراف کا کسی کو یارا نہیں۔ ستاسی ویں سورۃ کی پہلی تا تیسری آیات میں اِس حقیقت کی طرف اِشارہ موجود ہے: ''آپ اپنے ربِ اعلیٰ کے نام کی تسبیح بیان کرتے رہیں، اُس رب کی جس نے ہر شے کی تخلیق کے ساتھ اِسے تناسب اور کاملیت عطا کی اور اسی نے ہر شئے میں اس کے فرائض ودیعت کردئے، اور ان فرائض کی ادائیگی کیلئے انکی رہنمائی بھی کی۔''

زمین ہو یا آسمان، سورج ہو یا چاند، بادل ہو یا بجلی، حشرات الارض ہوں یا وحشی جانور، مچھلیاں ہوں یا پرندے، غرض کہ ہر مخلوق کو انتہائی کاملیت کے ساتھ اور نہایت متناسب ڈھنگ سے، کمال درجے کی جسامت اور غایت درجے کے حجم، رنگوں اور ساخت کے بہترین انتخاب کے

ساتھ وجود بخشا اور جب تخلیق معرضِ وجود میں آئی تو یہ ایک ایسی کامل، خوبصورت اور بری الخطاء شئے تھی جس پر عقلِ انسان حیران رہ گئی۔ تخلیق کے نقشہ میں کوئی خرابی، نہ رنگ میں کسی قسم کی عدم دل پذیری، نہ ساخت میں کوئی ٹیڑھا پن۔ کہیں کوئی کمی نہیں، کہیں کوئی عیب نہیں۔ انگور کا سائز الگ ہے تو تربوز کی جسامت الگ۔ مرغ کی ساخت مختلف تو ہاتھی کی اور، مور کے پنکھ میں رنگوں کی دنیا آباد کردی تو کوے کو ایک ہی رنگ کا تحفہ عنایت کیا اور خوبصورتی میں دونوں کی انفرادیت باقی رکھی۔ آسمان میں گھٹتے بڑھتے چاند کا منظر جدا تو اُفق پر طلوع اور غروب ہوتے سورج کے حسن و جمال کی دنیا الگ۔ کس کس تخلیق کی دلنشینی کا ذکر کیا جائے۔ کاغذ کے پہاڑ ختم ہوجائیں گے، سمندروں کے پانی کے مقدار کی سیاہی ناکافی ثابت ہوجائے گی اور رب تعالیٰ کی تعریف، حمد وثناء اور اسکے کمالات کے تذکرہ میں کہنے کے لیے پھر بھی اتنا کچھ باقی رہ جائے کہ اِس کا تذکرۂ مکرّر پھر ایسی ہی صورتحال پیدا کردے اور حمد وثنا کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو پائے گا۔

ذرا طویل پہاڑی سلسلوں کو دیکھئے کہ ان میں ہمارے لئے کس قدر نشاناتِ عبرت موجود ہیں۔ ربِّ کائنات نے ہمیں خبر دی کہ پہاڑوں کو زمین کے توازن قائم رکھنے کی اُس نے ہدایت کی ہے تاکہ انسان پرسکون طور پر اپنی زندگی کے فرائض ادا کرنے میں مصروف رہ سکے۔ پھر ان ہی پہاڑوں میں انسانوں کے لیے اُس نے معدنیات اور منرلس Minerals کے خزانے محفوظ کر دئے۔ ان ہی پہاڑوں کے اندر سے پانی کے چشمے جاری کردئے اور یہی وہ چشمے ہیں جو آگے بڑھتے ہیں اور بلاخیز ندیوں کی شکل اختیار کرکے ہزاروں کیلومیٹر تک بہتی چلی جاتی ہیں اور انسانی آبادیوں اور انکی کھیتیوں کو سیراب کرتی چلی جاتی ہیں۔ پھر ان ہی پہاڑوں کو گھنے جنگلات کے سلسلوں سے سجادیا گیا اور یہ جنگلات قوت کا سرچشمہ بن گیے۔ عمارتی لکڑیوں کی فراہمی ہو کہ سازوسامان کی نقل وحرکت کے لیے بننے والے بکسوں کے لیے درکار لکڑی، اِن ہی پہاڑوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ پھر جڑی بوٹیاں بھی تو ان ہی جنگلات سے حاصل کی جاتی ہیں۔ پھر وہ پہاڑ جن پر جنگلات نہیں ہوتے، اِن کے رنگوں کے ذریعے زمانۂ قدیم ہی میں انسانوں کو اشارہ دیا کہ کہاں کس قسم کی معدنیات مدفون ہوسکتی ہیں۔ عصرِ حاضر میں اللہ تعالےٰ نے انسانوں کو سائنسی علوم سے کیا نوازا کہ اب وہ مصنوعی سیارچوں کے ذریعہ زمین کی گہرائی میں پوشیدہ خزانوں سے تک واقف ہونے لگے ہیں۔ سیارچوں کی آنکھوں سے انسان کو زمین پر موجود پہاڑوں کے رنگوں کا منظر نظر آتا ہے اور اِن ہی رنگوں کی بنیاد پر اُسے زمینی خزانوں کی شاہ کلید میسر آتی ہے۔ پہاڑوں

کے اِن ہی رنگوں کے بارے میں پینتیسویں سورۃ کی ستائسویں آیت میں یہ تذکرہ موجود ہے:
''...اور پہاڑوں میں بعض کے رنگ سفید، بعض سرخ دھاریوں والے اور بعض مختلف رنگوں کے بھی اور بعض گہرے سیاہ ہوتے ہیں۔''

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کہیں برف کی سفیدی اوڑھے بلند و بالا پہاڑ ہیں تو کہیں درمیانی اونچائی کے پہاڑ سامانِ عبرت لیے سطحِ زمین پر ایستادہ نظر آتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں جنگلی جانوروں کی نہ صرف موجودگی ہے بلکہ ان کی تعداد میں ایک تناسب بھی قائم ہے۔ حشرات الارض کی شکل میں نوع بہ نوع قسم کی مخلوقات بھی زمین میں پھیلا دی گئیں اور اس سارے نظامِ کوہستانی کے پس منظر میں ایک ہی محرک کارفرما کہ زمین کو اور زمین کے ماحولیات کو ایک توازن سے آشنا کرایا جائے جس کا ذکر ہم ابھی مذکورہ آیت میں پڑھ آئے ہیں۔ ان پہاڑوں کو مخصوص تناسب کے ساتھ کم یا زیادہ بلندی دے کر ہزاروں میل تک ان کے سلسلے دراز کر دئے۔ جب سمندروں سے مانسونی بادل اُٹھتے ہیں تو ہوائیں انہیں اپنے دوش پر لیے ان پہاڑوں سے جاٹکراتی ہیں اور انہیں الگ الگ سمتوں میں پھیلا دیتی ہیں تا کہ زمین کا کوئی گوشہ بارش کی برکتوں سے محروم نہ رہ جائے۔ پھر اِن سلسلہ ہائے کہسار میں ہر دو پہاڑوں کے درمیان ایک مناسب فاصلے پر درّے بھی رکھ دئے گیے، تا کہ انسانی قافلے زمین میں اپنا رزق تلاش کرنے میں آسانی سے نقل وحرکت کر سکیں اور پہاڑوں کی رکاوٹوں کے احساس سے بری ہو کر زمین میں اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اِن پہاڑوں میں غاروں کی گنجائش پیدا کی تا کہ پُر خطر حالات میں لوگ انہیں جائے قرار بنا سکیں۔ سولہویں سورۃ کی اکیاسیویں آیت میں اِس کا تذکرہ ملتا ہے: ''اور اے انسانو، (تم دیکھتے نہیں کہ) اللہ نے تمہارے لئے جو چیزیں بنائیں ان میں تمہارے لئے سائے اور سائبان بنائے اور اسی نے پہاڑوں میں بھی تمہارے لئے غار اور درّے بنائے۔!''

ہمالیائی کوہستانی سلسلوں اور آلپ کے پہاڑی سلسلوں میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ ہزاروں میل طویل ہیں اور کئی کئی ممالک سے ہوتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پھر ان کے بھی کئی ذیلی سلسلے پائے جاتے ہیں۔ سطح سمندر سے ہزاروں فٹ بلند الگ الگ اونچائیوں والی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان میں بھی انسانی سفر کے لئے درّے موجود ہیں، وادیاں ہیں۔ اگر انسان اپنی عقلِ سلیم کو استعمال کرے، تو اپنے رب کے کرم اور فضل کو پہچان سکتا ہے۔ جس طرح ان پہاڑ کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، مختلف اونچائی ہوتی ہے، اسی طرح انکی اندورنی بناوٹ بھی مختلف ہوتی

ہے۔ان میں مختلف پرتیں Layers ہوتی ہیں۔خود زمین کے اندر بھی کئی طرح کی مختلف پرتیں ہوتی ہیں۔ یہ پرتیں بھی بڑے بڑے پہاڑوں کی مانند ہوتی ہیں۔سطح زمین کے نیچے کی Plate مسلسل حرکت کررہی ہے۔سائنسی زبان میں اسے Earth Crust کہا جاتا ہے۔اسکی وجہ سے بھی پہاڑوں کی بلندی اور تہہ بنتی ہے۔ یہ عمل ایک ایسی دھیمی رفتار سے جاری رہتا ہے کہ عام طور پر نہ ہم اسے دیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔زمین کے پیٹ میں اب بھی ایک طرح کی جہنم دہک رہی ہے۔ہمارا رب لاوے کی شکل میں قیمتی معدنیات وہاں سے ہمارے لئے آتش فشاں کی صورت میں برآمد کرکے عطا فرماتا ہے۔کبھی کبھی زمین کی پرتوں کے سفر اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ کے اثرات، زمین کے اوپر بسنے والوں پر پڑتے ہیں۔سمندروں کی سطح کے نیچے کی زمین میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے۔وہاں بھی زلزلے آتے ہیں۔اس کا اثر بھی زمین کے اوپر آباد مخلوق پر پڑتا ہے۔ان پہاڑوں کو اونچائیوں سے سرفراز کرنے والا رب ہمیں اپنی کتاب میں اپنی ہستی کی پہچان کرواتے ہوئے ایک نایاب ہدایت دیتا ہے۔سترہویں سورۃ کی اڑتیسویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا: ''اور تم زمین میں اکڑ کر نہ چلنا، بے شک تم زمین کو نہ تو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی تم پہاڑوں کے برابر خود کو بلند کر سکتے ہو۔''

غرض کہ ماحولیات کا یہ سارا نظام جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر زمین پر کثیر تعداد میں آباد انسان ہی مستفید ہو رہے ہیں، آخر کس قوتِ باحشمت کا برپا کیا ہوا ہے؟ کون ہے وہ جس نے اِس سارے نظام کی تخلیق فرمائی اور کس نے اِس پورے منظرنامے کی منصوبہ بندی کی ہے؟ کیا اِن سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے خالق کو کسی مقام پر جاکر ڈھونڈنا پڑے گا؟ کیا یہ بے پناہ نشانیاں اِس ضرورت کو باقی رہنے دیتی ہیں کہ خالق کو ڈھونڈ کر ہی اُس کی عظمت کا اعتراف کیا جائے۔! ہرگز نہیں۔

کون ہے ان پہاڑوں کو بلندیوں کا تحفہ عطا کرنے والا؟ کون ہے وہ جو زیرِ زمیں پہاڑوں کو چلانے کی قدرت رکھتا ہے جو بظاہر جامد و ساکت نظر آتے ہیں؟ کون ہے وہ جس کی گرفت میں زمین کے اندر اور باہر کے ایک ایک ذرے کی حرکت ہے؟ ایک باشعور انسان کو جس نے اپنی عقل کے دروازوں کو..... وا..... رکھا ہے، پکار اُٹھنا چاہیے کہ یہ نظام اُس واحد خلاق العلیم کا برپا کردہ ہے جس نے اِس کائنات کی تخلیق کی ہے اور اِس کائنات کے زمین جیسے ذرے پر انسان کی تخلیق فرمائی۔!! دانا و بینا انسان ضرور پکار اٹھے گا انتہائی قوتوں والا ایک زبردست مالک ہے جس کا کوئی

شریک نہیں، جس کو چیلنج کرنے کی کسی میں مجال نہیں، جس نے اِس نظام کو پل پل سنبھالے ہوئے ہے، جسے ہر شے کی خبر ہے، نہ اس سے کوئی چھپ سکتا ہے، نہ اس کی پکڑ سے بھاگ سکتا ہے۔ سزا کا مستحق ہو تو نہ سزا سے بچ سکتا ہے اور جزا کا مستحق ہو تو نہ انعام سے محروم رہ سکتا ہے۔ تو پھر کیوں نہیں ہم اُس کی بارگاہ میں اپنے سر کو جھکا دیتے، اپنے دل و دماغ، اپنے جسم و روح، اپنے ایمان و عمل کے ساتھ! کیا ہم نہیں دیکھتے کہ کائنات میں موجود ناقابلِ یقین ہیئت رکھنے والے اجسام ہی نہیں، پوری کائنات مالک کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے اور رب تعالیٰ کی تابعِ فرمان ہے ....! بائیسویں سورۃ کی اٹھارویں آیت ہمارے سامنے ہے: ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے آگے کس طرح (وہ سب اشیاء) سجدہ ریز ہیں جو آسمانوں اور زمین میں (اپنا وجود رکھتے ہیں) اور کس طرح آفتاب و ماہتاب اور کوہ و شجر اور (ہر نوع کے متحرک) جاندار (بھی اپنے معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں) اور لوگوں کی کثیر تعداد بھی (اُس کی بارگاہ میں اپنی جبینیں جھکائے ہوئے ہے)، پھر (اپنی جبینوں کو سجدوں کی سعادت دینے والوں میں) اُن لوگوں کی اکثریت بھی (شامل ہے) جن پر عذاب (کی مہر) ثبت ہو چکی ہے۔ اور اللہ جسے ذلیل کر دے تو اُسے (مقامِ) تکریم عطا کرنے والا کوئی نہیں ہے، بے شک اللہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔''

ساڑھے پانچ فٹ کے ایک انسان کو ''عقل'' نامی ایک ایسے Device کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے جس کے استعمال سے وہ نہ صرف زندگی کے ہر نشیب و فراز سے واقف ہو جاتا ہے بلکہ سمندروں کی گہرائیوں، پہاڑوں کی اونچائیوں، ہواؤں کے بہاؤ کو ناپنے لگتا ہے اور اِن کی حسبِ کیفیت اِن سے اپنے رویوں کا تعین کرتا ہے اور اپنی زندگی کو محورِ تعیش عطا کر کے اپنی عقل پر اِترانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پھر وہ رفتہ رفتہ اِسی عقل کو، عقل دینے والے کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں پر لگا دیتا ہے۔ لیکن اُس کی عقل کی حقیقت تب کھلتی ہے جب وہ اپنے اختیارات کا حدود آشنا ہو جاتا ہے اور یہ مقام وہ ہوتا ہے جہاں سے پلٹنا اُس کے بس کی بات نہیں ہوتی یعنی وہ Point of No Return پر پہنچ جاتا ہے۔ اِس لیے کہ سمندر بپھر جاتے ہیں، پہاڑ آتش فشاں بن کر لاوا اُگلنے لگتے ہیں، ہوائیں آندھیوں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور بگولے اِنسانی عقل ہی کو نہیں خود انسان ہی کو اُڑا لے جانے کے لیے تیار رہتے ہیں، پاؤں تلے زمین کھسکنے لگتی ہے۔ اُس کی قوت و حشمت اور قابلیت و صلاحیت بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ تب اُسے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگتا ہے، وہ سارا شرک بھول کر ایک ہی خالق و مالک کے آگے جھکنے پر آمادہ ہوتا ہے اور اِسی

بحران میں وہ شرک کو بھولنا چاہتا ہے اور خلوص کے ساتھ صرف اپنے خالق کو پکارنے لگتا ہے۔ لیکن بقول شاعر ؎

جب زمین پھٹتی ہے آتا ہے سمندر میں اُبال　　تب تو فرعون بھی اقرارِ خدا کرتے ہیں

پھر ہوتا کیا ہے! اِس سے پہلے کہ سرکش انسانی عقل اپنی بے بسی کا رونا روئے، یہی عقل، انسان اور انسانوں کے شرک و سرکشی سمیت فنا ہو جاتی ہیں۔ نارمل حالات میں اپنے رب کے ساتھ آخر ہمارا وہ تعلق کیوں نہیں برقرار رہتا جو بحران کی حالت میں عود کر آتا ہے؟ جیسے ہی حالات نارمل ہو جائیں تو کیوں ہم بے راہ روی اختیار کر لیتے ہیں؟ ہم اپنے مالک سے ویسا ہی خوف کیوں نہیں محسوس کرتے جو بحرانی حالات میں اُس کے غضب کے سبب ہم پر طاری رہتا ہے؟ کیوں ہم دوبارہ اپنی تعیّشانہ طرز زندگی میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر اپنے خالق سے وہ ربط باقی نہیں رہتا جو رہنا چاہیے۔؟ یہی استفسار ہے جو ہمیں سترہویں سورۃ کی سڑسٹھویں آیت میں ملتا ہے جس میں خود ہمارا رب ہم سے پوچھتا ہے: ''اور جب بحر (مطلاطم) میں تمھیں کوئی مصیبت گھیر لیتی ہے تو (تمہارا یہ طرز عمل ہوتا ہے کہ تم) اُن سب (معبودانِ باطل) کو نظر انداز کر دیتے ہو جنھیں تم نے (عام حالات میں اپنی حاجت روائی کے لیے) پکارا تھا، مگر (اپنی نجات کے لیے) صرف اُسی (ربِّ واحد سے فریاد کرتے ہو)، پھر جب وہ تمھیں (طوفانوں سے) بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو (تمہارا طرز عمل بدل جاتا ہے اور) تم (اُسی ربِّ حقیقی سے) اعراض برتنے لگتے ہو، (سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ) انسان بڑا ناشکرا واقع ہوا ہے۔''

سمندر پر ایک نگاہ ڈالیے، حد نظر تک پانی ہی پانی، دوسرے کنارے کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں۔ سر پر جو آسمان ہے اُس پر ایک نگاہ ڈالیے، اِس کی بھی کوئی حد نظر نہیں آتی۔ اوپر آسمان کی بے نیازِ حدود اونچائیاں اور نیچے سمندر کی اتاہ گہرائیاں۔ ایسے میں کسی ہوائی پرواز کے دوران ہوائی جہاز میں کسی خرابی کی خبر مسافروں کے درمیان پھیل جاتی ہے تو ان کی ذہنی کیفیات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ جب بچنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی اور امید کی ہر کرن موہوم ہو جاتی ہے، تب انسان سراسیمگی کے عالم میں کتنی لگن اور کس قدر اخلاص کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے! لیکن جیسے ہی حالات نارمل کی طرف لوٹتے ہیں تو وہ بھی دھیرے دھیرے اپنی پرانی روش پر آنے لگتا ہے۔ لیکن ایک باشعور انسان کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر صورتحال میں.... راحت ہو کہ مصیبت.... اپنے رب کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف ہوائی پرواز یا سمندری سفر میں ہی ایسی

صورتحال پیدا ہو جائے، بلکہ زمین پر کسی وقت بھی انسان سے تمام دنیوی سہارے چھن سکتے ہیں بجز خدائے لاشریک کے سہارے کے۔ایسے میں انسان لامحالہ اُسی خدائے واحدہ' لاشریک کو پکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج نت نیے جدید سائنسی آلات جیسے کمپاس کی موجودگی میں انسان کے لیے اپنی سمتِ سفر معلوم کرلینا اور منزل مقصود پر پہنچ جانا دشوار نہیں رہ گیا ہے۔لیکن اِن ایجادات سے پہلے بھی انسان اپنے سفر کی ان دشواریوں پر قابو پا چکا تھا۔رب تعالےٰ نے آسمان پر آفتاب ومہتاب اور سیاروں اور ستاروں کی جو انجمن سجا رکھی ہے وہ اُس کے بہت کام دیتی تھی۔دن میں سورج کے طلوع اور غروب کے قدرتی منظر سے اور رات میں چمکتے ستاروں کے ذریعہ اپنی سمتِ سفر معلوم کرکے ایک مسافر طویل فاصلے طے کرلیتا اور اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا تھا۔حتیٰ کہ طویل سمندری وصحرائی اسفار بھی وہ اِن ہی قدرتی مناظر کی مدد سے بڑی کامیابی کے ساتھ مکمل کرلیتا تھا۔یعنی زمانہ کوئی بھی کیوں نہ ہو اور انسان کسی زمانے کا کیوں نہ ہو، اُس کی نقل وحرکت میں جب خدائی رہنمائیاں شاملِ حال رہی ہیں تو ظاہر ہے، وہ سفر جو دنیا سے ہوتے ہوئے، آخرت کی منزل کی سمت کیا جاتا ہے، اِس سفر کی کامیابی کا انتظام بھی رب تعالیٰ نے کر ہی دیا ہے، یعنی ایک طرف اندرونی سسٹم کے ذریعہ انسان کو ضمیر واختیار کی آزادی اور اچھے برے کی تمیز عطا کی اور دوسری طرف بیرونی طور پر نبیوں، رسولوں اور کتابوں کے ذریعے اُس کی حقیقی منزل کا پتہ بتایا گیا، تاکہ انسان اپنی آخرت کے سفر کو صحیح سمت میں جاری رکھ سکے۔اپنے رب کے اِن عظیم احسانات وانتظامات کے بعد اب ہمارا یہ فرض بننا چاہیے کہ ہم اپنے رب کی رضا کا راستہ چن لیں اور کتابِ ہدایت.....القرآن.... سے اپنا رشتہ جوڑ لیں، اُسوۂ حبیبِ کبریا کو اپنا لیں، احکاماتِ الٰہی کی روشنی میں اِس راہ کے آداب سے واقف ہو جائیں اور منزلِ آخرت پر شاداں وفرحاں پہنچ کر عیشِ دوام سے ہم آغوش ہو جائیں۔یہی حقیقی منزل بھی ہے اور یہی حقیقی منزل رسی بھی ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان حقائق پر غور کرکے ہم اپنے غرور وتکبر کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردیں، اپنی ذات کی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے اپنی تمام تر قابلیتوں اور صلاحیتوں کی چوٹیوں کو اپنے رب اعلیٰ کے آگے سجدہ ریز کرواکے دم لیں، اس سے قبل کہ وہ وقت آجائے جب یہ قوی ہیکل پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھر رہے ہونگے اور ہنگامۂ حشر برپا ہو چکا ہوگا اور مہلت عمل ختم ہو چکی ہوگی۔!!

قربانی کے ایک بکرے میں چند لوگوں کی شرکت حدیث وآثار کی روشنی میں

از: مفتی شکیل منصور القاسمی
شیخ الحدیث مجمع عین المعارف، کنور، کیرالہ

جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صرف تین قسم کے جانوروں کی قربانی ہی درست ہے۔(۱) بھیڑ، بکری نر و مادہ (۲) اونٹ نر و مادہ (۳) گائے، بھینس نر و مادہ۔ (بدائع الصنائع جلد ۵ صفحہ ۶۹، پاکستانی) اونٹ کم سے کم پانچ سال کا، گائے بھینس کم سے کم دو سال کی اور بکری کم سے کم ایک سال کی ہو۔ البتہ مینڈھا میں یہ تخصیص ہے کہ اگر وہ چھ ماہ کا ہو لیکن اتنا فربہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں ایک سال کا معلوم ہو تو اس کی قربانی بھی جائز ہے۔ (ایضاً)

فقہاء احناف وشوافع کے یہاں بڑے جانوروں کی قربانی میں زیادہ سے زیادہ سات آدمی، اور بھیڑ بکری میں صرف ایک آدمی شریک ہوسکتا ہے۔ ادائِ فریضہ قربانی کی حیثیت سے ایک بکرے میں کسی بھی قسم کے متعدد افراد کی شرکت ناجائز ہے، ہاں ایک بکرے کی قربانی میں حصول ثواب کے لیے بیشمار لوگوں کو شریک کرنا حنفیہ کے یہاں نہ صرف جائز بلکہ سنتِ رسول ہے، جیسا کہ آنے والی سطروں میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی وضاحت کی جائے گی۔ اس کے برخلاف حضرت امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق اور اصحابِ ظواہر وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ ایک بکرا یا ایک بھیڑ ایک گھر کے سینکڑوں افراد کی طرف سے اسقاطِ فریضہ کے لئے کافی ہے والحق أنها تجزئ عن أهل البيت وإن كانوا مأة نفس أو أكثر. (نیل الاوطار للشوکانی جلد ۳، صفحہ ۱۲۱)

ایک بکرے میں متعدد لوگوں کی شرکت کے جواز وعدم جواز کے سلسلہ میں اصولی طور پر یہ دو نقطہائے نظر ہیں۔ نفس دلائل تو دونوں فریقوں کے پاس ہیں البتہ قوت وضعف کے اعتبار سے دیکھا جائے تو فریقین کے دلائل میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ جس کو ہر وہ شخص محسوس کرسکتا ہے جو ہر قسم کی عصبیت اور جانبداری کے خول سے باہر نکل کر عدل وانصاف کے تناظر میں حدیث کو دیکھنا

چاہتا ہو۔ دلائل کے تجزیہ سے قبل یہ ذہن میں رہے کہ سارے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ قربانی میں جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان میں سب سے آخری حد ''بکری'' یا بھیڑ ہے۔ یعنی اس سے نیچے یا کم کی صورت میں کسی بھی فقیہ کے یہاں قربانی جائز نہیں ہوگی۔ (ان الشاة اقل ما تجب، وذکر الانزاری أن هذا اجماع، اعلاء السنن جلد ۱۸ صفحہ ۲۰۱)

احناف وشوافع کے سامنے بنیادی طور پر حضرت جابرؓ کی یہ حدیث ہے: نحرنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالحديبية البدنة عن سبعة والبقر عن سبعة. (نصب الرایہ جلد۴، صفحہ ۲۰۹، موطا مالک مع اوجز جلد۴، صفحہ ۳۰۲) اس حدیث میں چونکہ ''بدنۃ'' یعنی اونٹ اور ''بقرۃ'' یعنی گائے اور بھینس کو ہی سات آدمیوں کے لیے کافی قرار دیا گیا ہے نہ کہ بکرا وغیرہ کو اس لیے انہی جانوروں میں سات افراد کی شرکت جائز ہوسکتی ہے نہ کہ بکرے میں۔ شرکت کو جائز قرار دینے والوں کے سامنے اصولی طور پر حضرت ابوایوبؓ کا یہ اثر ہے: كنا نضحّى بالشاة الواحدة يذبحها الرجل عنه وعن اهل بيته فيا كلون ويطعمون حتى تباهى الناس فصار كما ترى، ابن ماجه، ترمذی، ابوداؤد، نيل الاوطار ۳/ ۲۰)

امام شوکانی اس حدیث کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں فيه دليل على ان الشاة تجزئ عن اهل البيت وان كانوا مأة نفس او اكثر. (نیل الاوطار جلد۳، صفحہ ۱۲۱)

آگے تحریر کرتے ہیں کہ چونکہ حضرات صحابہ پورے گھر والے کی طرف سے ایک بکری ذبح کرتے تھے اور آپؐ کو اس کا علم تھا لیکن آپؐ نے اس سے ان کو روکا نہیں۔ لہٰذا اس سے بھی اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ بلاشک وریب ایک بکرا پورے گھر والے کے لیے کافی ہے۔

غور وتدبر اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو حضرت ابوایوب انصاری کی یہ حدیث "مانعين تعدد" کے خلاف نہیں بلکہ ان کی تائید میں ہے۔ اس لئے کہ احناف کے یہاں صاحب نصاب پر صرف اس کی طرف سے قربانی ضروری ہے اس کی اولاد اور اسکی بیوی کی طرف سے اس پر قربانی واجب نہیں۔ اسی مفہوم کو بتانے کے لئے حضرت ابوایوب انصاری فرماتے ہیں کہ يذبحها الرجل عنه وعن اهل بيته الخ. حدیث مذکور کی یہ توضیح اس لیے کی گئی ہے کہ اگر اس سے تعدد کا جواز ثابت کردیا جائے تو پھر حضرت جابر کی جس حدیث میں آیا ہے کہ "ضحّى النبي صلى الله عليه وسلم عمن لم يضحّ من امته" اور حضرت ابورافعؓ کی حدیث: ضحى النبي صلى الله عليه وسلم عن جميع امته، ان دونوں حدیثوں کا تقاضہ تو بظاہر یہ ہے کہ ایک بکری تمام

مسلمانوں کے لیے کافی ہے۔ پھر حضرت امام مالک واحمد وغیرہ کا گھر کے افراد کے ساتھ تخصیص کرنے کے کیا معنی ہیں؟ نیز اگر ایک بکرے میں مثلاً سات افراد کی شرکت کو جائز مان لیا جائے تو قربانی کے جانور کی اقل مقدار ایک بکری رہی یا اس کا ساتواں حصہ رہا؟ جبکہ ابھی گذر چکا ہے کہ اقل مقدار ایک مکمل بکری ہونے پر سارے فقہاء کا اجماع ہے، تو کیا یہ حضرات حدیث کا ایسا مفہوم بتانے کی اجازت دیں گے جس سے خرقِ اجماع کے علاوہ خود ان کے مسلمات کی تردید ہوتی ہو؟

نیز اگر ایک بکرے میں گھر کے سینکڑوں افراد کا شریک ہونا درست مان لیا جائے تو پھر حدیث پاک ”من وجد سعةً ولم یضحّ فلا یقربنّ مصلانا“ کے کیا معنی ہوں گے؟ یعنی قربانی کی استطاعت کا پھر کیا مفہوم ہوگا؟ کیوں کہ یہ بات خلاف عقل ومشاہدہ ہے کہ گھر کے سینکڑوں افراد مل کر بھی ایک بکرے کو خرید نہ سکیں؟ ایسی صورت میں تو ہر بڑے کنبہ اور افراد والے ”مستطیع“ شمار ہوں گے۔ اور ایک بکرا بھی ادا نہ کرسکنے کی صورت میں وعید مذکور کے مستحق ہوں گے!

الغرض ان معنوی خرابیوں کے پیش نظر یہی معنی مراد لینا زیادہ صحیح ہے کہ ابوایوب انصاری کے اثر کا مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ ایک بکرے کی قربانی کے ثواب میں اپنے تمام گھر والے کو شریک کرلیا کرتے تھے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ادائی فریضہ کے طور پر ایک بکری میں گھر کے تمام افراد شریک ہوجاتے تھے۔ اس مفہوم کی تائید ابورافع کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے بکری قربانی کی تو ایک بچی نے یہ کہا: وعنّی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وعنكِ (اعلاء، جلد ۱۸، صفحہ ۲۱۰) اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایک بکری میں اسقاطِ فریضہ کے لئے نہیں بلکہ ہدیۂ ثواب کے لئے تعدد واشتراک جائز ہے۔ اور احناف کا یہی مفتی بہ مذہب ہے۔ امام شوکانی نے حضرت ابوایوبؓ کی روایت کے الفاظ: ”کنا نفعل“ کو مرفوع بتا کر اس سے تعدد کے جواز ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل تعجب ہونے کے علاوہ بیجا جانبداری کا بین ثبوت ہے۔ امام شوکانی کے یہاں جب فعل صحابہ مطلقاً حجت نہیں ہے، تو ابوایوب انصاری کا مذکورہ فعل کیسے اور کیوں کر حجت بنا؟ اس کا منصفانہ جواب بھی آنا چاہئے۔ یہ تمام توجیہات تو اس صورت میں ہیں جبکہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث کو معمول بہ مانا جائے۔ ورنہ اگر اس حدیث کو منسوخ مان لیا جائے جیسا کہ خاتم المحدثین امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں متعدد روایتوں سے ثابت کیا ہے تب تو یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہی ہوجاتا ہے کہ ”قربانی کے ایک بکرے میں ایک آدمی سے زیادہ افراد کی شرکت کا ناجائز ہونا ہی اقرب الی السنۃ ہے“

اسلامی معاشرے کے لیے راہِ نجات

از: محمد شاہ نواز عالم قاسمی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہم جانتے ہیں کہ خاندان کی ابتدا مرد وعورت کے باہمی تعلق سے ہوتی ہے، یہی مرد وعورت کچھ دنوں کے بعد والدین کہلاتے ہیں، بچے جوان ہوتے ہیں، تو ازدواجی رشتے پھلتے پھولتے اور کنبے و قبیلے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کا کارواں آگے بڑھتا ہے اور یہ رنگا رنگ وحدتیں پھیلتی اور سنورتی ہوئی معاشرے کا روپ دھار لیتی ہیں؛ لیکن جب کسی معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان بادسموم کے بے رحم تھپیڑوں کی زد میں ہو تو علامہ اقبال کی پیشین گوئی:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کو مکمل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس معاشرتی تباہی و بربادی سے نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ قرآن وحدیث میں بتائے ہوئے واضح نقوش اور تابناک راہیں ہیں۔

خاندان کے اِدارے کے لیے طلاق کا لفظ پیغام اجل ہے، اس کی تباہی دنیا کے بیش تر ملکوں میں خطرناک وبا کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ ایک سروے کے مطابق مغربی ممالک میں خاندانی اِدارے تیزی سے بربادی اور ویرانی کی راہ پر گامزن ہیں، اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک سال ۱۹۹۰ء میں امریکہ میں ۱۶۲۰۰۰/ شادیاں ہوئیں اور ۴۲۶۳۵ طلاق کے واقعات رونما ہوئے۔ آسٹریلیا میں ۱۱۶۹۴۵/ شادیاں ہوئیں اور ۱۱۱۷۰۰۰/ طلاقیں، ڈنمارک میں ۳۰۸۹۴/ شادیاں اور ۱۵۱۵۲ طلاقیں، سوئزرلینڈ میں ۴۶۶۰۳/ شادیاں ہوئیں اور ۱۳۱۸۳/ طلاق کے واردات پیش آئے۔ یہی حال کم وبیش دگر ممالک کا ہے جہاں خاندانی اِدارے برق رفتاری سے اجڑ رہے ہیں جب کہ ان ملکوں میں باضابطہ شادی کا رواج کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے اور بغیر شادی کے اکٹھے رہنے کو محبوب ترین عمل تصور کرتے ہیں۔

اِس کے علاوہ نیوز ویک میں ۱۶/ جولائی ۱۹۹۰ء کو شائع شدہ رپورٹ کے مطابق امریکہ

میں ہر سال تیس چالیس عورتوں پر جسمانی تشدد ہوتا ہے، ہر اٹھارہ سیکنڈ کے بعد ایک عورت تشدد کا نشانہ بنتی ہے، امریکہ میں مقیم ہر چار عورتوں میں سے تین کم از کم ایک مرتبہ تشدد کے جرم کا نشانہ بن چکی ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس ساری دنیا کو انسانیت کی لڑی میں پرونے کے لیے آنے والے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش اسلوبی سے طلاق دیے جانے کو بھی "ابغض المباحات" (جائز کاموں میں سب سے برا) قرار دیا ہے۔ پھر میاں بیوی کے درمیان اختلاف کی صورت میں یہ طریقہ نہیں ہے کہ نوبت فوراً طلاق تک پہنچ جائے؛ بلکہ ایک طرف خاتون سے کہا گیا ہے کہ اگر اس کا شوہر بدمزاج ہے تو جدائی کے بجائے صلح وآشتی کی راہیں تلاش کی جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں بیوی پر کچھ حقوق کی کمی بیشی پر آپس میں صلح کرلیں اور صلح ہر حال میں بہتر ہے۔ (النساء: ۱۲۸)

دوسری طرف مرد کو تلقین کی گئی کہ اگر عورت بدمزاج، سرکش، بداخلاق اور بدسلوکی پر آمادہ ہو تو پہلے اسے نصیحت کرو، پھر اسے خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دو؛ تاکہ اسے احساس ہو کہ عارضی جدائی مستقل جدائی کا باعث بھی ہوسکتی ہے پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہو تو اسے سرزنش کرو اگر صلح پر آمادہ ہوجائے تو اسے اذیت دینے کے بہانے مت تلاش کرو اور اگر کام بنتا نظر نہ آئے تو پھر معاملہ دونوں خاندانوں کے سربرآوردہ افراد کے پاس لے جاؤ کہ شادی اسلامی معاشرے میں محض لڑکے لڑکی کا معاہدہ نہیں بلکہ یہ دو خاندانوں میں مودت والفت پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اگر دو طرفہ فیصلہ کرنے والے راہِ مصالحت تلاش کرنا چاہیں تو خاندان ٹوٹنے سے بچ جائے گا؛ لیکن اگر کوئی راہِ مصالحت تک رسائی ممکن نہ ہو تو مرد مخصوص حالات اور شرائط کے مطابق ایک طلاق دے؛ تاکہ فریقین کے درمیان نظر ثانی کی راہیں وَا رہیں۔

قرآن وحدیث کی ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو بچانے کے سلسلے میں اسلامی شریعت کس قدر حساس ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں لوگ آغاز ہی تین طلاقوں سے کرتے ہیں اور جب ان کے حواس بحال ہوتے ہیں اور عقل ٹھکانے لگتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سب کچھ لٹ گیا ہے پھر مختلف فقہی مذاہب کے دروازے پر دستک دے کر علما کے سامنے دست بستہ واپسی کی راہیں معلوم کرتے پھرتے ہیں۔ جو شخص یک بارگی تین طلاق دیتا ہے وہ قرآن وحدیث کی صریح نص کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے جو یقیناً عظیم جرم ہے،

کیا یہ مجرم کسی سزا کا مستحق نہیں؟ اگر ایک آدمی ظہار وایلا وغیرہ کے بعد کفاروں سے گزر کر واپس آسکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ طلاق کے سلسلے میں قطعی نص کی صریح خلاف ورزی کرنے والے کے لیے کوئی تعزیری سزا نہ ہو۔ اگر اس جرم کی سزا مقرر کردی جائے کہ مردوں کو پتہ ہو کہ مجھے دس کوڑے یا ایک سال قید، یا پچاس ہزار روپے جرمانہ یا کچھ نہ کچھ سزا لازماً بھگتنا پڑے گی تو کسی شخص کو بھی اتنا غصہ نہیں آئے گا کہ وہ نصوص قرآنیہ کو پامال کرتا ہوا خاندانی ادارے کو تہ وبالا کردے۔

یہ مذہب اسلام ہی ہے جو طلاق کے ناگزیر فیصلے کے بعد بھی نفرت کی دیوار کھڑی ہونے نہیں دیتا؛ بلکہ مطلقہ عورت کو بھی بہت سے حقوق ملتے ہیں۔ اِرشاد باری تعالیٰ ہے: جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انھیں مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کردیا جائے۔ (البقرہ:۲۴)

آج کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اگر مطلقہ بیوی اپنے بچوں کی پرورش کررہی ہے تو اسے ہماری عدالتیں صرف بچے کا خرچ دیتی ہیں جب کہ قرآن حکیم ان کو الگ سے اس کا خرچ دلاتا ہے۔ اِرشاد باری تعالیٰ ہے: اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا حمل وضع نہ ہوجائے پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو اس کی اجرت انھیں دے دو۔ (الطلاق:٦)

یہ بحث ایک نومسلم خاتون ''خوالہ لکاتا'' کی رائے پر ختم کی جاتی ہے جو اس نے اسلامی پردے پر گفتگو کرتے ہوئے دی ہے؛ کچھ عورتیں صرف اس وقت عمدہ پوشاک زیب تن کرتی ہیں جب وہ گھروں سے باہر نکلتی ہیں انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ گھروں کے اندر کس طرح رہتی ہیں؛ لیکن اسلام میں عورت اپنے شوہر کے لیے دل کش ہونے کی کوشش کرتی ہے اور شوہر بھی اپنی بیوی کے لیے پُرشکوہ اور بارعب نظر آنے کی کوشش کرتا ہے ایک دوسرے سے متعلق اسی قسم کے جذبات ازدواجی زندگی کو پُرلطف اور پُرمسرت بناتے ہیں، کوئی عورت کسی مرد کی توجہ اپنی جانب کیوں مبذول کرانا چاہتی ہے جب کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے کیا وہ اس بات کو پسند کرتی ہے کہ دوسری عورتیں اس کے شوہر کو اپنی طرف مائل کریں؟ اِس طرح کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام خاندان کے استحکام کے لیے کتنا معاون و مددگار ہے؟ حالیہ دنوں میں اعلیٰ خاندان کی انگریز عورتوں کی مسلم نوجوانوں میں دل چسپی کا محض سبب یہ ہے کہ اسلام کا خاندانی نظام محکم اور پائیدار ہے جو محض نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان ہے اگر آج کی انتہائی بزعم خود ترقی یافتہ اقوام بھی اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوش ہوجائیں تو ان کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے۔

ترک رفع یدین کے سلسلہ میں ابن عمرؓ کی حدیث کی تصحیح اور البانی کی تردید

از: مولوی محمد شاکر معروفی

عن ابن عمرؓ مرفوعاً : أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یَرفع یَدیہ إذا افتتح الصلوٰۃ ثم لایعود .

ترجمہ: ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو رفع یدین کرتے اس کے بعد نہیں کرتے تھے۔

مذکورہ حدیث کے سلسلہ میں البانیؒ کا کہنا ہے کہ یہ باطل اور موضوع حدیث ہے، جس کو امام بیہقی نے اپنی کتاب (الخلافیات) کے اندر محمد بن غالب کی حدیث سے روایت کیا ہے وہ احمد بن محمد البیروتی سے اور وہ عبداللہ ابن عون الخرّاز سے اور وہ امام مالک سے اور وہ امام زہری سے اور وہ حضرت سالم سے اور وہ اپنے والد عبداللہ ابن عمرؓ سے اور عبداللہ بن عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

اس پر البانیؒ کا کہنا ہے کہ اس سند کا ظاہر ٹھیک ہے جس کی بنا پر بعض حنفیہ دھوکہ کھا گئے اس کے بعد امام حافظ مُغُلطائی کا قول: (لا بأس بسندہ) جو اس حدیث کے سلسلہ میں وارد ہوا اس کو ذکر کرکے بطور تعجب کہتے ہیں کہ صحیحین، سنن اربعہ، اور مسانید میں امام مالک کے طریق سے مذکورہ سند کے ساتھ ابن عمرؓ سے رکوع میں بھی رفع یدین منقول ہے، اور ان کو مزید تعجب اس بات پر ہو رہا ہے کہ اس حدیث کے سلسلے میں امام بیہقی اور ان کے شیخ امام حاکم نے باطل اور موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔ شیخ ملا محمد عابد سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے امام حاکم اور بیہقی کے اس حدیث کو باطل اور موضوع قرار دینے پر تعاقب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ محض حدیث کے موضوع اور باطل ہونے کا دعویٰ کردینے سے حدیث موضوع اور باطل نہیں ہوسکتی تا آنکہ وجوہ طعن ثابت نہ ہوں، اور ابن عمرؓ کی اس حدیث کے رجال رجال الصحیح ہیں لہٰذا اب ضعف نہیں رہا مگر یہ کہ امام مالکؒ سے لینے والے راوی مطعون ہوں

لیکن اصل طعن نہ ہونا ہے چنانچہ یہ حدیث میرے نزدیک یقینی طور پر صحیح ہے، اور ابن عمرؓ نے جس وقت رفع کو دیکھا تو رفع کو بیان کیا اور جس وقت عدم رفع کو دیکھا تو اس حالت کی خبر دی، لیکن ان کی حدیث میں ان دو عملوں میں سے متعین طور پر کسی ایک پر ہمیشگی اور دوام کا پتہ نہیں چلتا، اور جہاں تک حدیث شریف میں لفظ (کَانَ) ہے تو وہ دوام اور ہمیشگی پر ہر وقت دلالت نہیں کرتا کیونکہ آپ ﷺ کے بارے میں وارد ہے کہ: (كان يقف عند الصخرات السُّود بعرفة) ترجمہ: آپ ﷺ عرفہ میں کالے پتھروں کے پاس ٹھہرتے تھے، حالانکہ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج (حجۃ الوداع) کیا ہے، لہٰذا اس حدیث کے تضعیف کی کوئی سبیل نہیں ہے چہ جائیکہ اس کو موضوع کہا جائے۔ امام سندھیؒ کا کلام ختم ہوا، دیکھئے (الامام ابن ماجہ وکتابہ السنن) معہ حاشیہ، ص:۲۵۲۔

اس مقام پر شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث کو امام مالکؒ سے لینے والے عبداللہ ابن عون الخرّ از ہیں جیسا کہ گذرا اور یہ مسلم اور نسائی کے رجال میں سے ہیں ابن حجرؒ نے تقریب کے اندر ان کو ثقہ، مامونٌ، اور عابدٌ کہا ہے۔ ان کا ترجمہ تقریب التہذیب، ص: ۳۱۷ رقم (۳۵۲۰) اسی طرح تہذیب الکمال ۴۰۲/۱۵ پر ملاحظہ ہو۔

اوپر ملا محمد عابد سندھی کا تعاقب حاکم اور بیہقی کے اقوال پر گذرا جس کو البانیؒ نے بنفس نفیس مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کا قول سمجھ کر ان پر رد کیا ہے اور جواب دینے کی کوشش کی ہے، جبکہ نعمانیؒ محض ناقل ہیں۔ قائل ملا محمد عابد سندھیؒ ہیں۔

بہرحال البانیؒ اپنی کتاب (سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة) کے اندر فرماتے ہیں کہ امام حاکم اور بیہقی نے بغیر دلیل کے حدیث کو باطل اور موضوع نہیں کہا ہے بلکہ ان دونوں حضرات کا دعویٰ دلیل کے ساتھ ہے اس شخص کیلئے جو سمجھنا چاہے، اور وہ حدیث کا شاذ ہونا ہے، اس کے علاوہ اور بھی دلائل ہیں جو ان دو اماموں کے فیصلہ کی تائید کرتے ہیں، اور قطع نظر دیگر دلائل سے صرف اتنی بات بھی مذکورہ حدیث کے بطلان کیلئے کافی ہے کہ خود امام مالکؒ نے اپنی کتاب (موطأ) شریف کے اندر اس مذکورہ حدیث کے خلاف حدیث کو ذکر کیا ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ امام مالکؒ سے ناقلین کی ایک جماعت اس کے خلاف ذکر کر رہی ہے، دیکھئے نسائی شریف ۱۶۱/۱، بخاری شریف ۱۰۲/۱، مسند احمد ابن حنبل ۶۲/۲ رقم الحدیث (۵۲۷۹) وغیرہ، متعدد سند کے ساتھ امام مالک عن ابن شهاب عن سالم بن عبدالله عن أبيه کے طریق سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کو شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے بالمقابل اٹھاتے تھے اور جب

رکوع کیلئے تکبیر کہتے اور جب اپنے سر کو رکوع سے اٹھاتے تو اسی طرح ان دونوں کو اٹھاتے، الحدیث والسیاقُ للبخاری عنه۔ آگے البانی کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث جس میں رکوع میں جانے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع یدین کا تذکرہ ہے اُس باطل حدیث کے مخالف جس میں صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع کا تذکرہ ہے امام مالکؒ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے چنانچہ ابن عبدالبرؒ نے امام مالکؒ سے ناقلین کے اسماء کو شمار کیا ہے، جن کی تعداد تیس تک پہنچتی ہے، اور ابن شہابؒ سے اس حدیث کو روایت کرنے میں امام مالکؒ کی ثقات کی ایک جماعت نے موافقت کی ہے۔ دیکھئے بخاری شریف ۱/۱۰۲، مسلم شریف ۱/ ۱۶۸، ابوداؤد شریف ۱/۱۰۴، ترمذی شریف ۱/ ۵۹، مسند احمد ابن حنبل ج ۲/ رقم الحدیث ۵۰۸۱ و ۴۵۴۰ و ۶۳۴۵ وغیرہ۔

اور امام زہریؒ کی جابر ابن یزید الجعفی نے متابعت کی ہے جس کو امام طحاوی نے اور امام احمدؒ نے اپنے مسند ج ۲/ رقم الحدیث (۵۰۵۴) پر ذکر کیا ہے، اور جعفی اگرچہ ضعیف ہیں مگر حدیث کے طرق متعدد ہیں جس کی بنا پر امام طحاوی نے خاموشی اختیار کی ہے۔

اور سالم کی نافع مولیٰ ابن عمرؓ نے متابعت کی ہے جو بخاری، ابوداؤد، بیہقی وغیرہ میں موجود ہے۔ دیکھئے بخاری شریف ۱/۱۰۲، ابوداؤد شریف ۱/ ۱۰۸، السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/ ۱۳۶۔

عن عبید الله عنه، اس کے علاوہ دو، تین متابعات کو اور بھی ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ سے یہ روایات اور طرق صحیحہ عبداللہ ابن عون الخراز والی روایت کے بطلان پر چند وجوہ سے دلالت کرتی ہیں:

(۱) جس کی طرف امام حاکم اور بیہقیؒ نے اشارہ کیا تھا کہ تمام ثقہ راوی اس حدیث کو امام مالکؒ سے لینے میں عبداللہ بن عون کی مخالفت کرتے ہیں اور اس رفع کو ثابت کرتے ہیں جس کی ابن عون کی حدیث میں نفی کی گئی ہے اور ان کی تعداد حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے، اور یہاں جانب مقابل میں جتنے افراد ہیں اگر ان سے بہت کم افراد کی مخالفت بھی کوئی ایک کرے تو اس سے اس فرد واحد کی روایت اہل علم کے یہاں شاذ اور مردود ہو جاتی ہے، چہ جائیکہ یہاں وہ بڑی تعداد میں ہیں۔

(۲) اگر امام مالکؒ کو عدم رفع والی حدیث کا علم ہوتا تو اس کو اپنی کتاب (موطأ) شریف کے اندر ذکر کرتے اور اس پر عمل کرتے، حالانکہ دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی، پہلی بات تو اس لئے کہ امام مالکؒ نے اُس حدیث کے مخالف حدیث کو اپنی کتاب (مؤطأ) شریف کے اندر ذکر کیا ہے، رہ گئی دوسری بات تو اس لئے کہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے اور وہ

تکبیر تحریمہ کے بعد بھی رفع یدین کے قائل تھے، جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب ترمذی شریف کے اندر اس کو نقل کیا ہے۔ (ترمذی شریف ۲/۳۷) تحقیق احمد محمد شاکر اور امام خطابی اور قرطبیؒ نے اس کو امام مالکؒ کا آخری اور اصح قول نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو فتح الباری (۲/۲۸۰)

(۳) ابن عمرؓ کا نبی ﷺ کی وفات کے بعد رفع مذکور پر محافظت کرنا، کیونکہ اگر ان سے عدم رفع والی حدیث ثابت ہوتی تو رفع نہ کرتے، باوجودیکہ ابن عمرؓ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ آپ ﷺ کی اتباع کے حریص تھے۔

علاوہ ازیں ابن عمرؓ سے سند صحیح کے ساتھ مروی ہے کہ جب وہ کسی کو عدم رفع کرتے ہوئے دیکھتے تو اسے کنکریوں سے مارتے تھے۔ (سنن الدارقطنی ۱/۲۸۹) کتاب الصلوٰۃ باب ذکر التکبیر ورفع الیدین عند الافتتاح والرکوع والرفع منه. (بخاری جزء رفع الیدین ص ۸)

(۴) اس حدیث کو ابن عمرؓ سے لینے والے ان کے صاحبزادے حضرت سالم ہیں، حالانکہ ان سے بھی رفع یدین ثابت ہے جیسا کہ امام ترمذی نے اس کو ذکر کیا ہے، پس اگر عدم رفع والی حدیث جس کو سالم اپنے والد سے نقل کررہے ہیں حق ہوتی تو اس کی بالکل مخالفت نہ کرتے جیسا کہ یہ بات ظاہر ہے۔

لہٰذا حاکم اور بیہقی کا ابن عون والی روایت کو باطل قرار دینا صحیح ہے، اور شیخ نعمانیؒ کا یہ قول کہ (یہ حدیث میرے نزدیک یقینی طور پر صحیح ہے) محال ہے۔

اور شیخ نعمانیؒ نے جو یہ کہہ کر جمع کیا تھا کہ مختلف احوال کی حکایت ہے وہ بھی باطل ہے کیونکہ دو حدیثوں میں جمع کرنے کی شرط یہ ہے کہ دونوں حدیثیں ثابت ہوں، لیکن اس وقت جبکہ ایک حدیث صحیح اور دوسری باطل ہو تو ایسی صورت میں جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہ بات کس طرح معقول ہو کہ ایک ہی راوی ایک مرتبہ کہے کہ رفع نہیں کرتے تھے اور دوسری مرتبہ کہے کہ رفع کرتے تھے اور وہ خود ایک مرتبہ بھی ان دونوں حالتوں کو ایک عبارت میں جمع نہ کرے، پس یہ ایسا ہی ہے جس کی احادیث میں کوئی مثال نہیں جانی جاتی۔ ہاں اگر اس طرح کا جمع دو صحابیوں سے مروی احادیث کے سلسلہ میں کیا جائے تو ٹھیک ہے۔

البانی کا کلام ختم ہوا دیکھئے (سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة) ۲/۳۴۶-۳۵۰۔

البانی کی تردید: عدم رفع والی حدیث کو حاکم اور بیہقیؒ کے موضوع اور باطل قرار دینے پر ملا محمد عابد سندھیؒ نے کہا تھا کہ محض دعوی کردینا حدیث کے بطلان کیلئے کافی نہیں ہے جب تک کہ

وجوہ طعن ثابت نہ ہو اس پر البانیؒ نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ حاکم اور بیہقیؒ کا فیصلہ دلیل کے ساتھ ہے اور وہ حدیث کا شذوذ سے محفوظ نہ ہونا ہے، اور البانیؒ کے زعم کے مطابق شذوذ وضع اور بطلان کو مستلزم ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ شاذ ہونا صحت اصطلاحی کے منافی نہیں ہے، نیز البانیؒ کا زعم محدثین کے قواعد کی رو سے غیر مسموع ہے، کیونکہ محدثین کے یہاں شذوذ کی وجہ سے حدیث کا موضوع اور باطل ہونا تو درکنار اسی میں اختلاف ہے کہ شذوذ ہونا صحت کے منافی ہے یا نہیں چہ جائیکہ موضوع اور باطل ہو۔

امام ابن الصلاح نے حدیث صحیح کی تعریف بایں الفاظ کی ہے: الحَديثُ المُسنَدُ الّذِیْ يَتّصِلُ إسنادُه بنقلِ العدلِ الضابطِ عنِ العدلِ الضابطِ إلٰى منتهاه ولا يكونُ شاذًا ولَا مُعلَّلًا . (مقدمة ابن الصلاح مع التقييد والإيضاح، ص:۲۱)

ترجمہ: صحیح وہ حدیث مسند ہے جس کی سند متصل ہو، شروع سے آخر تک عادل وضابط نے عادل وضابط سے نقل کیا ہو، اور شاذ اور منکر نہ ہو۔

اس پر امام سیوطیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن الصلاحؒ نے شاذ سے اپنی مراد کو واضح نہیں کیا جبکہ خود انھوں نے شاذ کے تین معنی ذکر کئے ہیں: (۱) مُخَالفةُ الثقة لأرجح منه ثقہ کا اپنے سے اوثق کی مخالفت کرنا۔ (۲) تفرّد الثقة مطلقًا، ثقہ کا مطلقاً تفرد خواہ مخالفت ہو یا نہ ہو (۳) تفرّد الراوی مطلقاً، راوی کا مطلقاً تفرد۔

اور اخیر کے دو معنوں کو رد کر دیا ہے لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ ان کی مراد پہلا معنی ہی ہے۔

اس کے بعد امام سیوطیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ: صحیح کی تعریف میں عدم شذوذ کی شرط لگانا اور فقدان شرط کی صورت میں اس حدیث کو صحت کا درجہ نہ دینا یہ امر مشکل ہے، کیونکہ جب سند متصل ہے اور اس کے تمام رواۃ عادل وضابط ہیں تو اس حدیث سے علت ظاہرہ منتفی ہوگئی پھر جب وہ معلول نہیں رہی تو اس پر صحت کا حکم لگانے سے کون سی چیز مانع بن رہی ہے محض اس کے راویوں میں سے کسی ایک کا اپنے سے اوثق یا اکثر کی مخالفت کر دینا ضعف کو مستلزم نہیں ہے بلکہ وہ صحیح اور اصح کی قبیل سے ہوگی یعنی جس حدیث میں مخالفت ہے اس کو صحیح اور اوثق یا اکثر کی روایت کو اصح کہا جائے گا، حافظ فرماتے ہیں کہ یہ صرف میرا ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ ائمہ محدثین میں سے کسی کو نہیں دیکھا گیا کہ وہ اس سند پر جس میں ثقہ اوثق کی مخالفت کر رہا ہے عدم صحت کا حکم لگاتے ہوں، ہاں یہ بات تو موجود ہے کہ وہ صحت میں دونوں کو برابر کا درجہ نہیں دیتے بلکہ بعض کو

بعض پر مقدم کرتے ہیں۔

صحیحین میں احادیث شاذہ کی چند مثالیں

اس کی مثالیں صحیحین وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔

من جملہ ان مثالوں میں حضرت جابرؓ کے اونٹ کا قصہ ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ کو اپنا اونٹ بیچنے میں کیا ثمن لیا تھا پس بعض روایات میں ہے "فَاشتَراہُ مِنّی بأُوقيةٍ" کہ نبی ﷺ نے مجھ سے اونٹ کو ایک اوقیہ میں خریدا، (بخاری ۲۸۲/۱) اور بعض راوی نقل کرتے ہیں تو ثمن دوسو درہم ذکر کرتے ہیں، اور بعض چار اوقیہ ذکر کرتے ہیں، اور بعض بیس دینار۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف (۳۷۵/۱) اور بعض حدیث میں چار دینار کا تذکرہ ہے بخاری (۳۰۹/۱) اسی طرح بعض حدیث میں ہے کہ حضرت جابرؓ نے رکوب کی شرط لگائی تھی کہ مدینہ تک اس پر سوار ہوکر جاؤں گا۔ بخاری (۳۷۵/۱)

اور بعض میں ہے کہ سوار ہونے کی شرط نہیں لگائی تھی، اس اختلاف کے باوجود امام بخاریؒ دونوں طرح کی روایات کو اپنی کتاب صحیح بخاری کے اندر لے آئے ہیں اور ان طرق کو ترجیح دی جس میں رکوب کی شرط ہے، اسی طرح اس حدیث کو ترجیح دی جس میں ثمن ایک اوقیہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ بخاریؒ کا دونوں طرح کی حدیثوں کو اختلاف کے باوجود ذکر کرنا اور اپنی کتاب صحیح بخاری کے اندر جگہ دینا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ محض مخالفت اور شاذ ہونا حدیث کو صحت کے درجہ سے نہیں گراسکتا ہے، ورنہ امام بخاریؒ دونوں طرح کی حدیثوں کو بخاری شریف میں نہ لاتے۔

نیز امام مسلمؒ حدیث مالک عن الزهری عن عروة عن عائشة کے طریق سے نبی ﷺ کا فجر کی دو رکعت سے پہلے لیٹنے کو ذکر کیا ہے حالانکہ زہری کے تلامذہ میں سے عام اصحاب جیسے معمر، یونس، عمرو بن الحارث، اوزاعی، ابن ابی ذئب، شعیب وغیرہم فجر کی دو رکعت سنت کے بعد لیٹنے کو ذکر کیا ہے اور جمیع حفاظ نے ان حضرات کی روایات کو امام مالک کی روایت پر مقدم اور راجح قرار دیا ہے اس کے باوجود بھی اصحاب الصحاح نے امام مالکؒ کی حدیث کو اپنی کتابوں کے اندر ذکر کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

ان مثالوں میں سے وہ حدیث بھی ہے جس کو امام بخاریؒ نے مناقب عثمانؓ کے تحت ولید بن عقبہ کی قصہ میں ذکر کیا ہے اور اسی میں ہے (فجلدهٔ ثمانين) کہ ان کو اسّی کوڑہ لگایا، حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ یہ وہم ہے خود بخاری کے اندر ہے (فجلد الوليدؓ أربعين جلدة) کہ ولید کو

چالیس کوڑہ لگایا خود امام مسلمؒ نے چالیس کوڑے والی حدیث کو اپنی کتاب مسلم شریف کے اندر ذکر کیا ہے۔ دیکھو فتح الباری: (۴۵۱۷-۴۶)

اس اختلاف کے باوجود کہ اسّی کوڑے والی روایت شاذ ہے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری کے اندر اس کو ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں جس کو (الامام ابن ماجہ وکتابہ السنن) ۲۹۹ تا ۳۰۱ کے حاشیہ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس کو اصح اور صحیح ماننے کی صورت میں یہ اشکال کیا جائے کہ اصح پر تو عمل ہو رہا ہے لیکن اس کے مقابل میں جو حدیث ہے باوجودیکہ وہ صحیح ہے اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے لہٰذا صحیح صرف نام کی رہی۔

اس کا جواب دیتے ہوئے حافظؒ خود ہی فرماتے ہیں کہ ہر صحیح حدیث کا معمول بہ ہونا ضروری نہیں ہے جیسا کہ ناسخ اور منسوخ کا معاملہ ہے کہ حدیث منسوخ کے صحیح ہونے کے باوجود اس پر عمل نہیں ہوتا اسی طرح یہاں بھی۔

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ یعنی ابن حجرؒ کا میلان اس شخص سے نزاع کا ہے جو شاذ کو صحیح کا نام نہیں دیتا، آگے فرماتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے اور مرجوح ہونے کی وجہ سے اس پر ضعف کا حکم لگانا لازم نہیں آتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے توقف کیا جائے۔

اور اس کی تائید اس شخص کے قول سے بھی ہوتی ہے جو صحیح اور شاذ کو ایک ساتھ جمع کر کے صحیحٌ شاذٌ کہتا ہے، دیکھئے (فتح المغیث ۱۸/۱)

(ابن حبان اور ابن خزیمہؒ نے حدیث صحیح کی تعریف میں عدم شذوذ کی شرط نہیں لگائی) ہے ابن حجرؒ نکت کے اندر فرماتے ہیں کہ: ابن حبان نے اتصال اور عدالت کے ساتھ ضبط اور عدم شذوذ وعلت کی شرط نہیں لگائی جیسا کہ ابن الصلاحؒ نے صحیح کی تعریف میں لگایا ہے۔

ابن خزیمہؒ نے اپنی کتاب کا نام رکھا ہے (المسند الصحیح المتصل بنقل العدل عن العدل من غیر قطع فی السند ولا جرحٍ فی النَّقَلةِ) پس اس میں جو شرائط ہیں وہ ابن حبان ہی کے شرائط کے مانند ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ابن حبان ابن خزیمہ کے علوم کو اخذ کرنے والے اور

انہیں کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔

اب تک جن باتوں کا تذکرہ ہوا وہ محدثین خاص طور سے اصحاب الصحاح کے مذہب کے مطابق تھیں۔ جہاں تک فقہا اور اصولیین کے مذہب کا تعلق ہے تو ان کے یہاں شاذ ہونا حدیث سے احتجاج اور اس کے مطابق عمل کرنے میں قادح نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابن دقیق العید نے (اقتراح) ص ۱۸۶ پر ذکر کیا ہے کہ حدیث صحیح کیلئے عدم شذوذ اور علت کی نفی کی شرط لگانا فقہاء کی نظر میں درست نہیں ہے کیونکہ بہت سارے عِلَل جس کی بنا پر محدثین حدیثوں کو معلول قرار دیتے ہیں وہ فقہاء کے اصول کے مطابق جاری نہیں ہوسکتے۔ نیز (شرح الالمام) میں ذکر کیا ہے کہ فقہاء اور محدثین ہر ایک کے اپنے الگ الگ طریقے ہیں، جو دوسرے کے یہاں نہیں ہیں کیونکہ فقہاء اور اصولیین کے قواعد کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر راوی عادل ہے اور جزم کے ساتھ روایت کرتا ہے نیز سچائی اور عدم غلط میں اس کا شمار ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس حدیث جس میں وہ مخالفت کرتا ہے اور جن کی مخالفت کرتا ہے دونوں میں کسی طرح جمع ہوسکتا ہو تو اس کی حدیث کو چھوڑا نہیں جائیگا۔

لیکن محدثین کے یہاں باوجودیکہ ثقات وعدول روایت کرنے والے ہوں کسی علت کا وجود انہیں اس روایت پر صحت کا حکم لگانے سے مانع ہوگا۔ انتہی

اس سلسلہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بہت ہی عمدہ بحث کی ہے چنانچہ (فتح الملہم) کے مقدمہ میں امام سخاوی کے مذکورہ قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح کے اندر شاذ کے نہ ہونے کی شرط لگانا اور شاذ کی تفسیر (مخالفةُ الثقة لِمَنْ هو أرجح منه) کے ذریعہ کرنا اس طرح کہ دونوں روایتوں کے درمیان جمع کرنا دشوار ہو، تو محدثین شاذ کا حکم لگانے میں محض کثرت عدد اور قوت حفظ کی بنا پر ارجحیت کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور دیگر وجوہات ترجیح کی طرف التفات نہیں کرتے جبکہ روایتوں کے درمیان وجوہ ترجیحات سو سے بھی زائد ہیں جیسا کہ سیوطیؒ نے (تدریب الراوی) میں ذکر کیا ہے۔ ہاں کبھی کبھی راویوں کے بعض دوسرے احوال کو بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن حکم اور معنی کے لحاظ سے جو دیگر وجوہ ترجیح ہیں ان کا خیال نہیں کرتے۔ اور شاید یہ اصطلاح ان کے اپنے موضوع کے اعتبار سے ہے کیونکہ ان کا اصل منصب اسناد پر حکم لگانا ہے۔

گویا انھوں نے اپنے منصب سے خارج چیز کو ان فقہاء اور اصولیین کے حوالہ کردیا ہے جن کا کام متون کو پرکھنا اور اس کے معانی سے بحث کرنا اور بعض کو بعض پر حکم اور معنی کے اعتبار سے ترجیح دینا ہے، اس لئے کہ ہر فن کے رجال ہوا کرتے ہیں جن کو اس فن میں دوسروں پر مقدم کیا جاتا ہے۔

امام ترمذیؒ اپنی کتاب ''جامع ترمذی'' ابواب الجنائز، باب ما جاء فی غسل المیت کے اندر فرماتے ہیں: کہ فقہاء احادیث کے معانی کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

ابن حبانؒ کا قول ہے کہ اگر سند کو دیکھا جائے تو شیوخ اولی ہیں اور متن کے اعتبار سے فقہاء اولی ہیں۔انتہی۔

اور جہاں تک محدثین شاذ کا حکم لگانے میں دونوں حدیثوں کے درمیان جمع کے دشوار ہونے کی شرط لگاتے ہیں تو ایک امر ایک قوم کے یہاں دشوار ہوتا ہے لیکن دوسری قوم کے یہاں آسان ہوتا ہے اور ائمہ وفقہاء احادیث کے متون میں جمع آسانی کے ساتھ کرلیتے ہیں انھیں دشواری نہیں ہوتی، لہٰذا اس بات میں فقہاء ہی مقدم ہوں گے۔

نیز صاحب التنقیح ابن عبدالہادی نے شفعہ کے سلسلہ میں عبدالملک ابن ابی سلیمان کی حدیث پر کلام کرنے کے بعد فرمایا ہے: کہ اس حدیث کے سبب سے امام شعبہؒ کا عبدالملک پر کلام کرنا اس میں قادح نہیں ہے کیونکہ عبدالملک ثقہ ہیں اور امام شعبہؒ فقہ کے ماہرین میں سے نہیں ہیں کہ احادیث میں تعارض کے وقت جمع کریں، ہاں وہ حافظ ہیں اور امام شعبہؒ کے علاوہ نے ان پر شعبہ کے تابع ہوکر کلام کیا ہے۔اس حدیث کو (ترمذی شریف ۱/۱۶۴، اور کتاب العلل ۲۴۰) پر دیکھا جاسکتا ہے۔پس انصاف یہ ہے کہ جب محدثین کے یہاں شاذ کا حکم لگانا کثرتِ عدد یا قوتِ حفظ اور ان جیسی چیزوں کی بناء پر ہے تو حدیث کا شاذ اور مردود ہونا فقہاء کے یہاں لازم نہیں آتا کہ احکام میں اس سے احتجاج درست نہ ہو۔کیونکہ وجوہ ترجیحات غیر محصور ہیں پس بعید نہیں ہے کہ ایک حدیث راوی کے تفرد یا قصور حفظ کی بناء پر مرجوح ہوجائے، کیونکہ شاذ اگرچہ کسی خاص جہت کی وجہ سے محدثین کے یہاں مرجوح ہونے کی بنا پر مردود ہوتی ہے تو وہ احتمال رکھتی ہے کہ ان کے علاوہ کے یہاں دوسری وجوہات کی بنا پر، متن کے اعتبار سے راجح ہو، لہٰذا محدثین کا شاذ کہہ دینا اس بات کو مانع نہیں ہے کہ ان کا غیر دیگر تمام وجوہات ترجیح کو چھوڑ دے، اور ایک شئی کے دو وجہوں کے اعتبار سے مردود اور مقبول ہونے میں کوئی منافات نہیں۔

شیخ عثمانیؒ کا کلام اختصار کے ساتھ پورا ہوا۔مقدمہ فتح الملہم ص ۵۱ و ۵۲۔

الحاصل: ماقبل کے بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ شاذ محدثین کی اصطلاح کے مطابق صحت اصطلاحی کے منافی نہیں ہے۔چہ جائیکہ اسکی وجہ سے وضع اور بطلان لازم آئے، اور یہ اصحاب الحدیث، خاص طور سے مصنّفین صحاح وغیرہ کے نزدیک ہے جہاں تک فقہاء اور اصولیین کا مذہب

ہے تو ان کے یہاں معاملہ اور وسیع ہے جیسا کہ ابن دقیق العید اور محقق عثمانیؒ کے کلام میں گزرا۔

اور اسی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام حاکم اور امام بیہقیؒ کا حدیث ابن عمر کو شاذ کی بنا پر باطل قرار دینا صحیح بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض شاذ ہونے کی وجہ سے باطل قرار دینا قواعد حدیث و فقہ دونوں کے مخالف ہے، اور سندھی یا نعمانیؒ کا امام حاکم اور بیہقی کے کلام پر تعاقب برمحل ہے۔

ابن عون کی حدیث کے چند متابعات وشواہد

مدونۃ الکبری (۱/۱۶۵) پر ابن وہب اور ابن القاسم نے ان کی متابعت کی ہے اور ابن عون کی مذکورہ روایت کی تائید عبداللہ ابن عمرؓ کے عمل سے ہوتی ہے جیسا کہ مجاہدؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی وہ تکبیر اولیٰ کے علاوہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، ملاحظہ ہو مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۱۴، رقم الحدیث ۲۴۵۲) نیز امام طحاوی اور بیہقیؒ نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے، اور عبدالعزیز ابن حکیم نے ان کی متابعت کی ہے جو کہ موطأ امام محمد کے اندر ہے، قال أخبرنا محمد بن أبان بن صالح عن عبدالعزيز بن حكيم به، اور محمد بن ابان اگرچہ ضعیف ہیں لیکن کذابین میں سے نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی احادیث کو لکھا جاتا ہے لہٰذا مجاہدؒ کی حدیث کو تقویت مل گئی، اور مجاہد کی امام بیہقی کے یہاں عطیہ عوفی نے بھی متابعت کی ہے جیسا کہ نصب الرایہ (۱/۴۰۶) پر ہے اور عطیہ عوفی اگرچہ متکلم فیہ رجال میں سے ہیں مگر متابعت میں ان کی حدیث لکھی جاتی ہے جو کہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، اور بخاری (الادب المفرد) کے رجال میں سے ہیں، ہاں سوار ابن مصعب جو ان سے نقل کرنے والے ہیں ان کی کچھ زیادہ ہی تضعیف کی گئی ہے۔

نیز امام شافعیؒ نے بھی اس حدیث کو امام مالک سے لینے میں عبداللہ بن عون کی متابعت کی ہے جیسا کہ عینیؒ کی (مبانی الاخبار) کے اندر ہے، ملاحظہ ہو (معارف السنن ۲/۴۶۸) اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ابن وہب اور ابن القاسم کی روایت میں صرف اتنی ہی بات پر اکتفاء ہے کہ نبی ﷺ افتتاح صلاۃ کے وقت رفع یدین کرتے تھے آگے نہ رفع کا ذکر ہے اور نہ ہی عدم رفع کا، تو ہم کہیں گے کہ (مدوّنہ) کے اندر ان کی روایت کو ترک رفع کی دلیل میں پیش کیا ہے، اور خود حافظ ابن حجرؒ فتح الباری (۲/۲۷۹ باب نمبر۸۴) پر ابن عبدالبرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ: (لم یر أحد عن مالك ترك الرفع فيهما إلا ابن القاسم) یعنی امام مالکؒ سے رکوع میں جانے اور اس سے

اٹھنے کے وقت عدم رفع کو صرف ابن القاسم نے روایت کیا ہے اور ص:۲۸۰ پر فرماتے ہیں: (ولم أر للمالكية دليلاً على تركه ولا متمسكاً إلا بقول ابن القاسم) پس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ (الاستذکار ۱/۴۰۸) باب افتتاح الصلوٰۃ، کی عبارت ملاحظہ ہو جس میں افتتاح صلاۃ للاحرام کے بعد عدم رفع کی بھی صراحت ہے: قال مالك فيما رواه عنه ابن القاسم: يرفع للاحرام عند افتتاح الصلاة ولا يرفع في غيرها، وكان مالك يرى رفع اليدين في الصلاة ضعيفا وقال: إن كان ففي الإحرام.

فتح الباری میں تو صرف ابن القاسم ہی کا ذکر ہے لیکن (المدونۃ الکبریٰ ۱/۱۶۵) پر ابن وہب بھی ہیں۔

نیز ابن عون الخراز کی روایت کی تائید امام مالک اور جمہور مالکیہ کے اس کے مطابق عمل کرنے سے ہوتی ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

جہاں تک البانی کا یہ قول ہے کہ ابن عون کی روایت کے بطلان کے لئے دیگر دلائل سے قطع نظر صرف اتنا بھی کافی ہے کہ امام مالکؒ اپنی کتاب (موطأ) کے اندر اس کے خلاف لفظ ذکر کیا ہے، تو یہ قول انتہائی کمزور اور غیر قابل اعتبار ہے، کیونکہ اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو رکوع میں جانے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع یدین والی حدیث جو کہ خود امام مالکؒ سے مروی ہے اور بخاری وغیرہ کے اندر موجود ہے اس کا بھی باطل ہونا لازم آئے گا، کیونکہ اسے بھی موطأ شریف کے اندر ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ اس میں تکبیر تحریمہ اور صرف رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع کو ذکر کیا ہے، دیکھئے (موطأ شریف ص ۲۵)

ان چار وجوہات کا ابطال جسکی وجہ سے البانی نے مذکورہ حدیث کو باطل قرار دیا ہے

پہلی وجہ: وہ حدیث کا شاذ ہونا تھا تو اس کا جواب تفصیل کے ساتھ آچکا کہ شاذ ہونا صحت حدیث کے لئے قادح نہیں ہے، اور نہ ہی اس کو حجت بنانے میں چہ جائیکہ وضع اور بطلان کا باعث بنے، اور ہم نے ابن عون کی حدیث میں جو شاذ ہونے کا گمان تھا اس کو متابعت وشواہد سے رفع کر دیا ہے جو کہ ابن عون کی روایت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

دوسری وجہ: دوسری وجہ اس حدیث کو امام مالکؒ کا اپنی کتاب موطأ کے اندر ذکر نہ کرنا تھا، تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے یہ بات لازم آئے کہ امام مالکؒ کو اس حدیث کا علم بھی نہیں تھا۔ کتنی

حدیثیں ایسی ہیں جو خود امام مالکؒ ہی سے مروی ہیں اور کتب متداولہ میں موجود ہیں مگر موطأ شریف میں نہیں ہیں، بلکہ امام مالکؒ نے رکوع میں جانے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع یدین والی حدیث کو بھی موطأ میں ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ البانی کے بقول امام مالکؒ کے یہاں وہ معمول بہ ہے۔

رفع یدین کے سلسلہ میں امام مالکؒ کے مذہب کی تحقیق

اس بات کا دعویٰ کرنا کہ امام مالکؒ نے زیر بحث حدیث پر عمل نہیں کیا ہے تو یہ محض دعوی ہے، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس پر عمل کیا ہے اور اس کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے، چنانچہ امام سحنون نے المدونۃ الکبری (۱/۱۶۵) میں ذکر کیا ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ مجھے رفع یدین معلوم نہیں ہے، نہ ہی جھکنے کے وقت اور نہ ہی اٹھنے کے وقت سوائے تکبیر تحریمہ کے وقت کہ تھوڑا سا ہاتھ اٹھایا جائے گا، ابن القاسمؒ کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ کے یہاں رفع یدین ضعیف ہے مگر تکبیر احرام میں۔

ابن عبدالبرؒ کی کتاب التمہید میں ہے کہ: واختلف العلماء فی رفع الیدین فی الصلاۃ فروی ابن القاسم وغیرہ عن مالك أنه كان یریٰ رفع الیدین فی الصلاۃ ضعیفًا إلا في تكبيرة الإحرام وحدها، وتعلق بهٰذه الرواية عن مالك أكثر المالكيين.

ترجمہ: اور نماز میں رفع یدین کے سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے چنانچہ ابن القاسم وغیرہ نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ امام مالکؒ نماز میں رفع یدین کو ضعیف سمجھتے تھے مگر صرف تکبیر احرام میں، اور امام مالکؒ کی اس روایت پر اکثر مالکیین کا اعتماد ہے۔ ملاحظہ ہو التمہید (۹/۲۱۲)

تنبیہ: اس جگہ اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موطأ شریف امام مالکؒ کا وہ مذہب نہیں ہے جس کو ان کے متبعین اختیار کرتے ہوں اور اس کی تقلید کرتے ہوں، بلکہ فتاوی اور احکام میں مالکیہ کا اعتماد اس پر ہے جس کو ابن القاسمؒ نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہو، خواہ وہ موطأ کے موافق ہو یا نہ ہو جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے تعجیل المنفعۃ، ص:۹ پر امام حسینی پر رد کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔

پھر امام مالکؒ سے عدم رفع کو نقل کرنے میں ابن عون متفرد نہیں ہیں، بلکہ ان کی متابعت ابن وہب اور ابن القاسمؒ نے کی ہے جیسا کہ گزر چکا۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم کے اندر ذکر کیا ہے: قال أبوحنيفة وأصحابه وجماعةٌ من أهل الكوفة: لا يستحب الرفع في غير تكبيرة الافتتاح، وهو أشهر الروايات عن مالك.

یعنی امام ابوحنیفہ اوران کے اصحاب اوراہل کوفہ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ میں رفع یدین مستحب نہیں ہے اوریہی امام مالکؒ سے مشہور روایت ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ مسلم شریف (۱/۱۶۸)

اورالجواہر النقی میں مع سنن بیہقی (۲/۷۶) میں امام قرطبیؒ کی شرح مسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ ترک رفع امام مالکؒ کا مشہور مذہب ہے، قواعد ابن رشد میں بھی اسی کو امام مالکؒ کا مذہب قرار دیا ہے۔

ابن رشد مالکیؒ اپنی کتاب بدایۃ المجتہد (۱/۱۹۳) میں ذکر کرتے ہیں: فمِنهُم مَن اقتصر به علىٰ الإحرام فقط، ترجيحاً لحديث عبد الله بن مسعود وحديث البراءُ بن عازب، وهو مذهب مالكؒ لِموافقة العمل به.

یعنی ائمہ میں سے بعض وہ حضرات ہیں جو عبداللہ ابن مسعود اور براء بن عازبؓ کی حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے صرف تکبیر احرام میں رفع کے قائل ہیں، اوریہی امام مالکؒ کا مذہب ہے اس پر عمل کے موافقت کی بنا پر۔

ان نقول معتبرہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام مالکؒ کا مذہب افتتاح نماز کے علاوہ میں عدم رفع ہی کا تھا، نیز ترمذی شریف کے نسخے مختلف ہیں چنانچہ ہندیہ (۱/۳۵) اور مجموعہ شروح اربعہ ترمذی (۱/۷۹) اور معارف السنن وغیرہ جو ہمارے پاس متداول ہیں اس میں قائلین رفع میں امام مالکؒ کا ذکر نہیں ہے، صرف بیروت کے جدید نسخہ میں بین المعکوفین (مالکؒ) امام مالکؒ کا نام ہے جو کہ کثیر نسخوں کے مقابلہ میں معتبر نہیں ہے۔

تیسری وجہ: وہ یہ تھی کہ ابن عمرؓ رفع پر محافظت کرتے تھے اوراس سے یہ مراد لیا گیا تھا کہ ترک رفع ان سے ثابت نہیں ہے، پس ماقبل میں ہم نے مجاہد اور عبدالعزیز ابن حکیم کی روایت سے یہ ثابت کردیا ہے کہ ابن عمرؓ افتتاح صلاۃ کے علاوہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

رہی البانی کی یہ بات کہ اگر وہ حدیث ابن عمرؓ سے ثابت ہوتی تو وہ رفع یدین نہ کرتے، پس یہ تو سرے سے مردود ہے، کیونکہ وہ کبھی رفع کرتے تھے اور کبھی رفع کو چھوڑ دیتے تھے بیان جواز اور نبی ﷺ سے دونوں کے ثابت ہونے کی وجہ سے۔

اور ابن عمرؓ کے علاوہ بہت سارے صحابہ کرامؓ سے مسنداً ترک رفع ثابت ہے جیسے ابن مسعود، براء بن عازب، ابوہریرۃ اور ابن عباسؓ وغیرہم اور صحابہ میں سے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کا اسی پر عمل رہا ہے۔

رفع یدین کے سلسلہ میں ابن عمرؓ کی حدیث کے الفاظ سات طرح کے وارد ہوئے ہیں

(۱) جس میں صرف شروع میں رفع کا ذکر ہے، المدونۃ الکبریٰ (۱/۱۶۵)

عن ابن وهب وابن القاسم عن مالك عن ابن شهاب عن سالم عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم.

نیز عبداللہ بن عون الخراز نے بھی امام مالک سے روایت کیا ہے (الخلافیات) للبیہقی۔

(۲) جس میں افتتاح صلاۃ اور رکوع کے بعد رفع کا ذکر ہے، معارف السنن (۲/۴۷۳)

(۳) جس میں رکوع اور سجدہ میں جاتے وقت رفع کا ذکر ہے، مجمع الزوائد (۲/۱۰۲)

(۴) جس میں افتتاح صلاۃ وانحطاط إلی الرکوع اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع کا تذکرہ ہے جس کو امام محمد نے اپنی موطأ کے اندر، اور بخاری، نسائی، ابوعوانہ، دارمی، طحاوی وغیرہم نے ذکر کیا ہے۔

(۵) جس میں ان مذکورہ تین جگہوں کے علاوہ دو رکعت کے بعد بھی رفع کا ذکر ہے، ملاحظہ ہو بخاری شریف، باب رفع الیدین إذا قام من الرکعتین.

(۶) جس میں مذکورہ چار جگہوں کے علاوہ سجدہ کے وقت بھی رفع کا ذکر ہے۔ (بخاری: جزء رفع الیدین)

(۷) جس میں ہر خفض ورفع، رکوع وسجود، قیام وقعود کے وقت نیز دو سجدوں کے درمیان بھی رفع کا ذکر ہے۔ (فتح الباری: ۲/۲۸۴)

یہ سات طرح کے الفاظ ہیں سب کے سب ابن عمرؓ سے صحیح طور پر ثابت ہیں، پس ان میں سے کسی بھی صورت کا انکار محض اس وجہ سے کہ ابن عمرؓ کا عمل ویسا نہیں رہا ہے ممکن نہیں ہے، لہٰذا ابن عمرؓ کی حدیث میں سیاق کا تنوع عہد رسالت میں رفع اور عدم رفع دونوں کے اوپر عمل کی دلیل ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو معارف السنن (۲/۴۷۳)

ابن عمرؓ کے عمل کی توجیه: جہاں تک ابن عمرؓ کا رفع یدین نہ کرنے والے کو کنکریوں سے مارنے کا تعلق ہے تو علامہ بنوری نے معارف السنن (۲/۴۶۶) میں یہ بیان کیا ہے کہ ابن عمرؓ کے اثر میں اِس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ رکوع کے وقت ہی رفع یدین نہ کرنے پر کنکریوں سے مارتے تھے، لہٰذا اس اثر کو اس رفع خلافی کا عنوان نہیں بنایا جا سکتا، پس

اس سے استدلال بھی صحیح نہ ہوگا۔اس اثر کے الفاظ اس طرح ہیں: أنّه إذا رأى مُصليًا لا يَرفع حَصَبَه. یعنی جب وہ کسی نمازی کو دیکھتے کہ وہ رفع یدین نہیں کررہا ہے تو اسے کنکریوں سے مارتے،تو ممکن ہے کہ ابن عمرؓ کی نکیر تحریمہ کے وقت رفع یدین نہ کرنے پر ہو، نہ کہ مطلق ترک رفع یدین پر،اور تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کی تاکید ظاہر ہے۔

چوتھی وجہ: چوتھی وجہ یہ تھی کہ ابن عمرؓ سے نقل کرنے والے ان کے صاحبزادے حضرت سالم ہیں اور وہ بھی رفع کے قائل ہیں۔

ہم کہتے ہیں اس سے بھی استدلال درست نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت سالم کے یہاں رفع یدین اولیٰ ہو، پس اس سے ترک رفع کا ناجائز ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ بہت سے ائمہ ہیں جن کی مرویات کے مطابق ان کا عمل نہیں ہے اسی بات کو امام رامہرمزی نے اپنی کتاب (المحدث الفاصل بين الراوى والواعى ص۳۲۳و۳۲۴) پر فرمایا ہے: (ولَيْسَ يلزَم المفُتى أنْ يُفتِيَ بجميعِ مَا رَوىٰ ولا يلزمه أيضاً أن يَتْرك رواية ما لا يُفْتىٰ به) کہ مفتی کو لازم نہیں ہے کہ اپنی تمام مرویات کے مطابق فتوی دے،اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ جس پر فتوی نہ دیا جائے اس کو ترک ہی کردے، اس کے بعد چند مثالیں بھی پیش کی ہے،اور فرمایا ہے کہ یہی امام مالکؒ اپنی مرویات میں سے بہت سی روایات کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

دعوی بلادلیل: سلسلة الاحاديث الضعيفة میں شیخ ناصرالدین البانی نے یہ بھی وہم دلایا ہے کہ زیر بحث حدیث میں غلطی محمد بن غالب تمتام سے ہوئی ہے جو کہ احمد بن محمد البرتی سے روایت کرنے والے ہیں، پس جاننا چاہئے کہ امام خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد (۱۴۴/۳ تا ۱۴۵) پر ان کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے: (كان كثيرَ الحديث صدوقًا حافظاً) یعنی وہ سچے اور حافظ تھے،اور امام دارقطنی نے کہا ہے: (وأما لزوم تمتام كتابَه وتَثَبُّتُهُ فلا يُنكَر ولا يُنكَر طلبُه وحرصُه على الكتابة) اور تمتام کا اپنی کتاب کو پختگی سے محفوظ رکھنا اور کتاب سے چمٹے رہنا ایسا ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں ہے اور ان کا طلب کرنا اور لکھنے پر حریص ہونا بھی قابل انکار نہیں ہے، نیز دارقطنی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے،حمزہ بن یوسف السّہمی کا کہنا ہے کہ امام دارقطنی سے تمتام کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: (ثقة مأمون، إلا أنه كان يخطئ، وكان وهم فى أحاديث) کہ وہ ثقہ ہیں مامون ہیں، مگر یہ ہے کہ غلطی ہوجاتی تھی اور بہت سی احادیث میں ان سے وہم ہوا ہے۔

اور حسن بن ابوطالب نے امام دارقطنی کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے تمتام کو ثقہ بتلایا ہے۔ تاریخ بغداد (۱۴۴/۳-۱۴۵) ملاحظہ ہو۔

امام ذہبیؒ نے ان کے بارے میں: حافظٌ مُکثِرٌ کا لفظ استعمال کیا ہے، اور ابن حبان نے اپنی کتاب الثقات کے اندر ذکر کیا ہے۔

تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو میزان الاعتدال (۶۸۱/۳) اور لسان المیزان (۳۳۷/۵) تاریخ بغداد مذکورہ صفحہ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زیر بحث حدیث شیخ ناصرالدین البانی کے مذہب کے خلاف ہے پس انھوں نے کھینچ تان کرنا شروع کیا یہاں تک کہ موضوع اور باطل تک کہہ دیا اور غیر معتبر وجوہات سے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ) کے تین چار صفحوں کو کالا کر رکھا ہے، جبکہ انصاف کے ساتھ جائزہ لینے سے اس شعر کے مصداق ہیں:

فدَعْ عنك الكتابةَ لَستَ مِنها

وَإنْ سَوَّدتَ وَجهك بالمداد

کہ لکھنا چھوڑ و تم اس کے اہل نہیں ہو، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم روشنائی سے اپنا منھ کالا کرتے۔

انصاف تو یہ تھا کہ خاموشی اختیار کرتے جیسا کہ ائمہ متقدمین کا عمل رہا ہے، کہ احمد بن سعید نے احمد بن خالد سے نقل کیا ہے کہ ہمارے یہاں علماء کی ایک جماعت ابن عمرؓ کی حدیث کے پیش نظر نماز میں رفع یدین کرتی تھی اور ایک جماعت ابن القاسم کی روایت کے پیش نظر صرف احرام میں رفع یدین کرتی تھی، اور ان دونوں جماعتوں میں سے کوئی کسی پر عیب نہیں لگاتا۔ ملاحظہ ہو الاستذکار (۴۰۹/۱) اور التمہید (۲۲۳/۹)

نیز ابن حزمؒ نے اپنی کتاب (المحلّٰی ۲۳۵/۳) کے اندر ذکر کیا ہے کہ جب نبی ﷺ سے دونوں طرح کا عمل صحیح طور پر ثابت ہے تو دونوں طرح عمل کرنا مباح ہوا نہ کہ فرض، لہٰذا ہم دونوں طرح عمل کر سکتے ہیں۔

پس اگر ہم نے رفع یدین کیا تب بھی ہم نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح نبی ﷺ نے پڑھی اور اگر رفع یدین نہیں کیا تب بھی اسی طرح پڑھا جس طرح نبی ﷺ پڑھتے تھے۔

لہٰذا کسی کو حق نہیں بنتا کہ ذخیرۂ احادیث پر ہاتھ لگائے اور غیر معتبر دلائل سے انہیں باطل اور موضوع قرار دے۔ واللہ ولی التوفیق.

اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کا کردار

از: سہیل اختر قاسمی

دینی مدارس، اور اسلامی اداروں کا وجود افادیت کا حامل ہے یا مضرت کا؟ اس عنوان سے مکمل جہات کو محیط متعدد نظریات پیش کیے جاچکے ہیں، جو اپنی معتبریت، موزونیت کے اعتبار سے مکمل اور کامل ہیں۔ آج کا ہر رسالہ، اخبار اور ان سرناموں اور عنوانوں کی توضیح وتشریح کرتے ملتے ہیں کہ آیا موجودہ مدارس اپنے جلو میں امن کا کارواں رکھتا ہے یا فساد وتباہی کا آتش فشاں، اب تک مجموعی طور پر جو نظریات سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب مدارس اسلامیہ کی شبیہ کو متوازن، امن پسند اور قومیت پسند ماننے کی تعبیر ہیں۔

اپنے وضوح (clarity) اور ایمانداری کے باوجود دینی مدارس کے دامن پر، تشدد پسندوں کی جانب سے جو الزام (دینی مدارس دہشت گرد اور امن مخالف ادارے ہیں) لگا ہے وہ واقعی تناظر میں صرف ایک تہمت کی حیثیت رکھتا ہے دراصل مدرسہ مشن سے جس خاص طبقہ (اسلام مخالف طبقہ) کو تکدر اور انقباض ہے وہی، مدرسہ مخالف کاز اور حرکات میں مساعد ومعاون ہوتا ہے، اس جہت سے اس کے افعال واعمال، مدارس مخالف ہی ہوتے ہیں، چونکہ نظریاتی سطح پر اس مفروضے کو تشہیر دی جاتی ہے اور اسے عوامی مقامات پر نمایاں کیا جاتا ہے جس سے ذہن سازی اور فکر سازی کی راہیں بھی ہموار ہوجاتی ہیں مگر تشہیر کا سہارا اسے ناقابل تکذیب سچ بنادیتا ہے اور غالباً اسی منہج عمل نے مدارس اسلامیہ کے پرامن ہونے کے حوالے سے غور وفکر کی راہ کھول دی ہے اور یہ دعوت دی ہے کہ مدارس کی امن پسند شبیہ کو سامنے لایا جائے اور ان کی خدمات کو اس تناظر میں جانچا جائے تاکہ زہر زدہ فضاء میں مدارس کے کردار کو زہریلی ہواؤں سے محفوظ رکھا جاسکے۔

مدارس اسلامیہ کی خشت اول امن کے گارے سے تیار ہوتی ہے اور اس کے مقاصد واہداف میں سلامتی اور تحفظ کا سایہ فگن ہوتا ہے اس واقعیت کے باوجود یہ پروپیگنڈہ کہ مدارس اسلامیہ دہشت گردی کے اڈے اور انتہا پسندی کے مراکز ہیں، معروضیت مخالف ہیں۔

پوری دنیا میں جس مدرسہ کی بنیاد سب سے پہلے پڑی تھی وہ رحمۃ للعالمین کی زیر سرپرستی صفہ کے نام سے قائم ہوئی تھی، رحم جس کا کام، سلامتی جس کا اعلان اور تحفظ جس کا نظام تھا، اسی روشنی سے جلا پانے والے ہزاروں مدارس دینیہ گزرے دور سے لے کر آج تک اسی اساس پر قائم ہیں ہندوستان میں دینی مدارس بھی اسی نظام امن کے پیامبر اور محافظ ہیں، دینی مدارس کی بنیاد ہی امن وسلامتی کے عنوان سے بنتی ہے اور اس کی تشکیل بھی خیر وخوبی کے صدائے عام سے ہوتی ہے۔

اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کے بنیادی کردار سے انکار، ایک برملا حقیقت کا انکار ہوگا! جن بنیادوں پر ان کا قیام عمل میں آیا ہے اس کا نتیجہ اور ہدف صالح اقدار کی تشکیل وتعمیر ہے، ان مدارس کا پس منظر یا ان کی تگ ودو (Works) کا نتیجہ، بہترین علماء، صاحب کردار فضلاء اور انسانیت کے علمبردار، حاملین اسلام کی پیداواری اور معاشرہ کی برائیوں، قباحتوں اور داخلی شورشوں کا انسداد ہے درحقیقت ان مدارس کا جو اساسی منشور اور بنیادی ہدف (Main target) ہے وہ ہے ''عالمی ضرورتوں کی اسلامی تکمیل'' یہی وہ دائرہ ہے جس کے تحت سارے مدارس کا وجود عمل میں آیا ہے، گویا اپنے عمومی اور اساسی مفہوم میں مدارس دینیہ کی تاسیس عالمی ضرورتوں کی اسلامی تحصیل وتکمیل اور انسانی احتیاجوں کی بھرپائی ہے۔ یہی مدارس کا خاص ہدف ہے اور عام ہدف بھی، ان سے گریز، یا دامن کشی، اپنی اساس سے اعراض ہوگا، اور اگر ایسا ہے تو واقعی یہ المیہ اور نامسعود (Unfortunate) ہے ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ، حقائق کا صحیح اور مناسب جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس اپنے اساسی منشور سے تھوڑے بہت گریزاں ہیں، یہ کوئی خواہ مخواہ کا قیاس اور رائے زنی نہیں، بلکہ موجودہ دینی اداروں کے اقدامات، رویوں اور عمل سے یہ بات معلوم ہوتی اور واقعی یہ بڑی تکلیف دہ ہے، اس حوالے سے دینی جامعات کو غور وفکر کی ضرورت ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری دینی جامعات کی گریز پائی یا دامن کشی، فقط یونہی نہیں، اس میں دینی مدارس کی جدید کاری کے عنوان سے چلنے والی تحریکات کے ردعمل کی نفسیات اور خوف کارفرما ہے اور شاید اس معاملہ میں مسلم علماء اور قدامت پسند ماہرین شرعیات کا عناد اور ہٹ دھرمی قابل معافی ہے کیونکہ وہ ردعمل کی نفسیات ہے، اگرچہ یہ ردعمل انتہا پسندانہ اور منفی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسے ردعمل سے مسلم امۃ کا نقصان ہے، اس حوالے سے غور وفکر اور تدبر کے مظاہرہ کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بہرکیف ان نقائص (جوکہ کچھ خاص حالات کے پیداوار ہیں) کے باوجود دینی مدارس کی افادیت، تعمیری حیثیت، اخلاقی ساکھ، تشکیلی امیج اور بنیادی ضرورت سے انکارنہیں کیا جاسکتا، آج بھی وہ مشعل راہ اورنقوش ہیں، اسے اپنا کر، اقدار کی اصلاح کرسکتے ہیں، اخلاقیات کی اشاعت ہوسکتی ہے، تعلیم کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، ناخواندگی کا انسداد ہوسکتا ہے، برائیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہےاور ہرطرح کی قباحتوں کوفنا کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔

درحقیقت دینی مدارس کا سارا نظام، عملہ طلبہ اور فاضلین جس کام اور مشن پر مامور ہیں وہ لاتفسدوا فی الارض کی تمثیل اطاعت پر مبنی ہے اس کا بنیادی مشن ہی معاشرے میں امن وسلامتی کی اشاعت ہے، جس قرآن وحدیث کی تعلیم ان مدارس میں ہوتی ہے اس کی خمیر ہی معاشرہ سازی اور انسانی نسل کی اصلاح وتعمیر ہے، مدارس دینیہ کے پورے مقاصد صرف اور صرف بنی نوع انسان کی اصلاح وتعمیر کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں، ان مدارس کا تعلیمی جائزہ یہ بتلاتا ہے کہ دنیا کا سب سے معتدل، اورمتوازن نصاب مدارس اسلامیہ میں رائج ہے جس نصاب میں تشدد، انتہا پسندی اور غلوآمیزی کا درس نہیں ہوتا ہے بلکہ امن وسلامتی، اصلاح وتعمیر اور معاشرہ سازی کی تعلیم دی جاتی ہے درحقیقت مدارس اسلامیہ کا نصاب وہ بہترین مشعل راہ ہے جس کی روشنی میں نصاب سازی اور ازسرنو تعلیمی نظام کی تخلیق پوری دنیا کوامن وسلامتی کی راہ پر لاکھڑا کرے گا، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سورج جیسے روشن حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے برتا جائے۔

الغرض مدارس اسلامیہ کا مکمل تعلیمی، تربیتی، اخلاقی، انتظامی، معاشی اور سماجی نظام اعتدال و توازن کا مظہر ہے اس کا ہرحصہ قابل اعتماد، اور ہرشعبہ اعتدال وامن پسندی کا داعی ہے مدارس کے صرف وبذل میں جس اعتدال کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ اقتصاد وتوازن کا اعلیٰ ترین مظہر ہے جس میں عیاشی، عیش کوشی اور سامان عیش وطرب کی فراہمی کے لئے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا بلکہ بنی نوع انسان کے لئے سامان درس ہوتا ہے، اس کا متوازن معاشی نظام ان تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کو یہ درس دیتا ہے کہ کھربوں اور کروڑوں روپے خرچ کرنے اور سامان تزئین کے بے پناہ استعمال کرنے کی وجہ سے آنے والے تعلیمی خرچ میں جو اچھال پیدا ہے اور جس طرح تعلیم کو مہنگا بنا کر پیش کیا گیا ہے جس کی بناء پر ہزاروں اور لاکھوں غریب بچوں کی دسترس سے تعلیمی حصولیابی دور ہوگئی ہے وہ افسوس ناک ہے کاش کہ یہ عیاشی اور دھاچوکڑی ختم کی

جائے تاکہ غریب سے غریب بچہ تعلیمی اسلحہ سے لیس ہوسکے اور علوم وفنون کا حاصل کرنا آسان ہوسکے۔

مدارس دینیہ کا انتظامی نظام وقار وسنجیدگی اور عدل ومساوات کا بہترین نمونہ ہے اگر یہ نقوش ہماری ہم عصری، عصری یونیورسٹیاں اپنالیں تو طلباء کی جانب سے ہونے والے احتجاجات اوراس کے نقصان میں ہونے والے ہرجوں سے محفوظ رہنا آسان ہوجائے گا۔

مدارس اسلامیہ کا اخلاقی نظام، اخلاق ومروت کے مظاہرہ کی دعوت دیتا ہے، سچ یہ ہے کہ طلباء علوم دینیہ کا حسن سلوک اور طرز معاشرت اتنا بلند اور ارفع ہے کہ اسے ہم سماوی رفعتوں سے تعبیر کرسکتے ہیں آج ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے ان نقوش کو اپنایا جائے اور ریگنگ کی انتہاء پسندی جوکہ اخلاقی دہشت گردی کی ہی ایک نوع ہے، اسکا سدباب کیا جاسکے۔

الغرض دینی مدارس، سراپا امن وسلامتی ہیں اس کا کردار ماضی میں بھی صاف ستھرا اور روشن تھا آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا درحقیقت دینی مدارس، ایک ایسا مشعل ہیں جس کی روشنی میں امن کا شہر قائم کیا جاسکتا ہے اور پرامن معاشرہ کی تکمیل ہوسکتی ہے آج اس کی ضرورت ہے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس ضرورت کو ضروری اور لازم سمجھا جائے۔

اسلام، ''امریکہ اور دہشت گردی''

از: حبیب الرحمٰن الاعظمی
متعلّم دارالعلوم دیوبند

دہشت گردی آج کے دَور میں ایک ایسی اصطلاح بن چکی ہے جس سے ہر طبقہ کے انسانوں کے کان آشنا ہیں۔ یہ لفظ سنتے ہی ذہن میں ایک خوفناک تصور قائم ہوجاتا ہے۔ وہ تصور کسی دلفریب وخوش گوار وادی کا نہیں۔ کسی پارٹی یا عدالت کا نہیں بلکہ انسانی احترام وعظمت کی پامالی کا، انسانیت کے تقدس کو بالائے طاق رکھ کر انسانوں کے لہو سے تربتر دامنوں کا، سڑکوں پر بہتے اور منجمد خونوں کا، بم دھماکوں اور سفاکیت کے اعلیٰ مظہر عراق، افغانستان اور فلسطین میں بے گناہ، معصوم بچوں اور عورتوں کے ساتھ وحشت وبربریت، ظلم وستم اور ناجائز طور پر ان کے حقوق کی پامالی کا ایک وحشت بھرا دردناک تصور انسانی ذہن میں قائم ہوکر ذہن ودماغ کے تاروپور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

دہشت گردی کی اس مسموم فضا میں صرف یہی نہیں بلکہ ظلم وجبر کے ایسے ایسے روح فرسا مناظر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ سینے میں پتھر جیسے دل رکھنے والوں کی بھی چیخیں نکل گئیں۔ سینوں میں ہمدردی اور انسانیت کی محبت اور اس کے نام پر دھڑکنے والا دل رکھنے والے انسانوں کی سسکیاں احساس کے کانوں سے سنی جاسکتی ہیں۔

دہشت گردی اصطلاح پر ہوئے واقعات میں جہاں انسانی ذہن خاک وخون میں تڑپتی لاشوں، کشت وخون، ظلم وبربریت اور تباہی وبربادی کے عریاں رقص میں ہلاکت وبربادی کے گھاٹ پر قربان ہوتے انسانوں کی جائداد، اموال اور مکانوں کی بربادی کا تصور قائم کرتا ہے۔ وہیں انسانی ذہن پر واقعات کی وہ بھیانک تصویر بھی ابھر آتی ہے جو مسلم وغیر مسلم ملکوں سے بہت سے مسلمانوں، خصوصاً لکھے پڑھے اور دین دار نوجوانوں کو گرفتار کرکے، اندرونِ افغانستان وعراق اور ''گوانٹاناموبے'' کے بدنام زمانہ جیل خانوں میں ڈال کر ان کے ساتھ جسمانی، جنسی، ذہنی اور فکری طور پر ایسی مجرمانہ حرکتیں کی گئیں اور اذیت رسانی اور توہین وتذلیل کے ایسے ایسے

طریقے وضع کیے گئے جن سے حقوقِ انسانی کے نام پر ساری دنیا نے آنسو بہادیے اور جس نے سارے انسانی ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا۔

چاہے وہ افغانستان، عراق، لبنان اور فلسطین کے معصوموں کے خون سے ہولی کے واقعات ہوں یا اپنے ملک میں بمبئی فسادات اور گودھرا حادثہ کے واقعات ہوں، گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی اور ظلم وتشدد کی ایسی سنگین مثال جس نے اچھے اچھے ظالموں اور سفاکوں کو بھی رلا دیا۔حالیہ واقعات میں تاریخ نے وحشت وبربریت اور جبر وتشدد کا ایسا ننگا ناچ اپنے سینے پر رقم نہیں کیا ہوگا۔ان سب کے پیچھے ہمیں ایک بڑا ہاتھ، وسائل سے بھرپور جبر وتشدد اور ظلم وستم کا پیکر کسی بہت بڑے مقصد کے لیے کارفرما نظر آتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ آتش وآہن کی بارش مسلم ممالک افغانستان اور عراق وفلسطین پر ہی برسائی جارہی ہے،کشت وخون کا یہ سارا کھیل اور ظلم وبربریت کا یہ ننگا ناچ مسلمان قوم کے ساتھ ہی کیوں خاص ہے؟ دہشت گردی کے جو واقعات پیش آرہے ہیں یا جنھیں کسی مقصد کے تحت برپا کیا جارہا ہے ان کی تہہ تک منصفانہ طور پر پہنچنے کے بجائے بے قصور مسلمانوں اور مسلم تنظیموں کے سر کیوں تھوپ دیا جاتا ہے؟ مصنوعی واقعات کے جھوٹے الزام میں کہیں سے کسی وقت بھی مسلم نوجوانوں کو کیوں اٹھالیا جاتا ہے انھیں طرح طرح کے بھیانک الزامات ومقدمات کے سہارے جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے کیوں ستایا جاتا ہے۔جیل خانوں کے جہنم نما تہہ خانوں میں انہیں کیوں رکھ کر سڑایا جاتا ہے۔مسلمانوں کے ساتھ درندگی ودرماندگی کا سلوک اور یہ وحشیانہ رویّہ کیوں اپنایا جاتا ہے؟

ان سوالوں کا جواب دیا جاسکتا ہے تو صرف یہی کہ وہ مسلمان ہیں۔اسلام کا کلمہ پڑھنے والے ہیں اور وہ فرزندانِ توحید اور شمع محمدیؐ کے پروانے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی، کا لیبل اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ چسپاں کرنے کا کھیل عالمی سازش کا حصہ ہے۔جس کی خاکہ سازی اور انھیں برپا کرنے کی عملی تدابیر میں عالمی صہیونیت اور اسلام دشمن عناصر یہودیت کا پورا پورا ہاتھ ہے۔جن کی چاپلوسی اور حکم برداری میں مسلم ممالک کے بعض اسلام بے زار حکمراں اور دیگر ممالک کی مسلم دشمن تنظیمیں پورے شدومد کے ساتھ اس کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کررہی ہیں اور وہ اسلام کو ''دہشت گرد'' مذہب اور مسلمانوں کو ''دہشت گرد'' قوم ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ہم اس بات کو بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ اسلام کو دہشت گردی کا مذہب اور

مسلمانوں کو دہشت گرد قوم ثابت کرنے کا اصل مقصد کیا ہے۔ اور اس کے بہانے مسلم نوجوانوں، دینی اداروں، اسلامی تنظیموں، مسلم دانشوروں اور علماء کرام کی مقدس ہستیوں کو دیدہ ودانستہ طور پر اس کا نشانہ بنانے کا مقصد کیا ہے...؟

اسلام جو خدا تعالیٰ کا آخری اور پسندیدہ دین ومذہب ہے، جس کے ہر ہر احکامات انسانی طبیعت کے عین مطابق اور نظام کائنات کی سلامتی وترقی کیلئے بنیاد اور سرچشمہ ہیں، حیات انسانی پر مشتمل سارے شعبوں میں رہ نمائی اور زندگی کی صحیح ڈگر سے ہٹے ہوئے لوگوں کی دستگیری کرتے ہیں، اس کی تعلیمات بڑی پاکیزہ، صاف وشفاف حقوق انسانی کی محافظ، امن وسلامتی کی ضامن اور مرضیٔ حق کے عین مطابق ہیں۔ نیز اسلام نے بڑی قلیل مدت میں اپنی صداقت وحقانیت پر صدہا ہزار مستحکم دلائل اور اپنی تلوار امن ومحبت اور مساوات وخوش اخلاقی کے ذریعہ پورے عالم کے حق پسند، حق جو اور حق شناس لوگوں کے قلوب میں جو غیر معمولی اور بے پناہ مقبولیت اور عظمت حاصل کرلی ہے اس پر معاندین اسلام کی حیرانی اور بوکھلاہٹ بے جا نہیں ہے۔ گرچہ وہ اسلام دشمن، خبیث ذہنیت کے حامل، دل سے اس کی صداقت وسچائی اور حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں، مگر ان کی بے جا دشمنی اور عناد نے انھیں حق کو تسلیم وقبول نہ کرنے اور اس کی مخالفت پر کمر کس لینے، نیز اسے دبانے اور مٹانے کیلئے آمادہ کردیا ہے۔

گرچہ امت مسلمہ عرصۂ دراز سے مغربی استعمار کا شکار ہے، مگر عصر حاضر میں مغرب اپنے تمام تر وسائل اور حربوں کو اسلام کے خلاف داؤ پر لگا دینے کیلئے آمادہ وبرسرِ پیکار نظر آتا ہے۔ جس کا مشاہدہ ہمیں مختلف فتنوں کی شکل میں آئے دن نظر آتا رہتا ہے، اور اگر اس طوفانی موجوں کے رخ کے پھیرنے اور سفینۂ اسلام کو بھنور میں پھنسنے سے بچانے کیلئے کوئی ناخدا پیدا ہوتا ہے اور ظلم وستم کے ان پہاڑوں سے ٹکر لینے کی سعی کرتا ہے تو وہ موج حوادث کے تھپیڑوں میں الجھ کر طوفان بلاخیز کی سازشی لہروں کا شکار ہوجاتا ہے۔ یا اسے بحرِ ظلمات کی ان کشتیوں کے حوالے کردیا جاتا ہے جہاں سے انسان سوائے موت کے اور کسی طرح رستگاری نہیں پاسکتا۔

اس جگہ یہ بات بھی مناسب معلوم ہوتی ہے جو باعث رنج اور تکلیف دہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے بعض بے حس اور اسلام بیزار حکمراں جو اسلام دشمن عناصر، صہیونیت اور یہودیت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے کھیل رہے ہیں اور وہ بے حس نام نہاد مسلم حکمراں ان خبیث ذہنیت دشمنان اسلام کی رضامندی کی خاطر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں جو کسی طرح بھی اسلام

کی پاکیزہ تعلیمات کے مطابق نہیں۔ان حکمرانوں کا کسی لالچ یا خوف یا بیک وقت دونوں باتوں کی وجہ سے ان معاندین اسلام اور یہودیوں کی سازش میں ہاں میں ہاں ملانا نیز مسلم ممالک کی بربادی اور بے گناہ مسلم عوام، معصوم بچوں، عورتوں اور نوجوانوں کی قتل وغارتگری پر ان کا خاموش تماشائی بنا رہنا، بلکہ ان میں سے متعدد بدبختوں کا اسلام دشمن طاقت امریکہ کا ساتھ دینا اور اس پر فخر کرنا کس چیز کا ثبوت اور کس بات کی غمازی وعکاسی کرتا ہے...؟

مضمون کا عنوان اس کی طوالت کے خوف سے ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مذکورہ بالاسطور کی تفصیل کی جائے ورنہ یہاں اس بات کو حقائق کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ امریکی واسرائیلی حواریین اور نام نہاد بے حس اور بے غیرت مسلم حکمرانوں نے امریکی اشارات و احکامات کے سامنے کیسے سرتسلیم خم کیا اور پھر عالم اسلام کے مسلمانوں کی دینی روح اور اسلامی حمیت اور اسلامی جوش وجذبات کو مجروح کرنے، مسلمانوں کو ذہنی وفکری طور سے عیاش اور مذہب سے آزاد، اسلام سے بیزار بنانے، اسلامی تعلیمات کو مٹانے، مسلم نوجوانوں میں یورپین تعلیمات کو پروان چڑھانے، ظلم وتشدد، کفر والحاد اور فرعونیت ونمرودیت کے فروغ کیلئے ان کا ساتھ دینے نیز اسلامی تہذیب وتمدن، ثقافت وکلچر، مسلمانوں کے دینی اداروں، تعلیم گاہوں اور ان کی ماضی کے شاندار وقار کو تہہ وبالا کرنے اور اسلامی تاریخ پر بدنما داغ لگانے میں ان دنیا پرستوں نے جو جو گل کھلائے وہ ناقابل بیان اور قوم مسلم کیلئے باعث صد ننگ وعار ہے۔

آج دنیا کی نگاہیں بڑی حسرت وامید کے ساتھ پھر کسی صلاح الدین ایوبیؒ، موسی بن نصیرؒ، محمد بن قاسمؒ وغیرہ کا انتظار کررہی ہیں۔ مساجد کی دلخراش شہادت ہمارے خودداری کے تار رباب کو جھنجھوڑ رہی ہے۔ وہ مسلم خواتین جن کی عزت وآبرو کو پامال کیا گیا، جن کے معصوم بچوں کو تلواروں اور نیزوں کی نوک پر لہرایا گیا وہ مائیں اپنی آنکھوں میں آنسو لیے بڑی شدت سے کسی صلاح الدین کو پکار رہی ہیں۔ ہماری وہ بہنیں جن کی عصمت وعفت کو داغدار کیا گیا، جن کے نازک معصوم سروں سے ان کی عزتوں کے آنچل کو نوچا گیا جن کی پاکیزہ زندگیوں کو بڑی بے دردی سے مسلا گیا... وہ بوڑھے ماں باپ جن کی آنکھوں میں گرم لوہے کی سلائیاں پھیر دی گئیں، جن کی پیاری زبانوں پر انگارے رکھ کر نکلوائے گئے، جن کی کمزور اور جھکی کمر پر کوڑوں سے سخت اذیت ناک پٹائی کی گئی۔ ان کی روحیں آج بھی سسک رہی ہیں، ان کی زبانیں ہماری مدد کو چیخ رہی ہیں۔ ان کی خاک وخون میں تڑپتی لاشیں ہمیں انتقام کیلئے پکار رہی ہیں۔ کیا ہماری غیرت ایمانی کو جوش

نہیں آتا؟ کیا ان معصوم بچوں اور ماؤں، ان پاکباز دوشیزاؤں کی چیخ وپکار اور آہ وفریاد پر ہماری رگِ حمیت نہیں پھڑکتی؟

اے ارض فلسطین کے فریادی مسلمانو! صبر کرو تمہارے اوپر ہوئے ظلم وستم کا انتقام لیا جائے گا۔ افغانستان اور عراق کے لاکھوں بے گناہ مسلمان شہیدوں کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ ظالم امریکہ واسرائیل سے اس کا بدلہ لیا جائے گا اور اے ظلم وبربریت اور فساد وسفاکیت کی چکیوں میں بڑی بے دردی سے پیسے گئے انسانو! اے گجرات کے مظلوم شہید مسلمان نوجوان مرد عورتیں اور بچے! تم دیکھو ذرا اب ہم کیسے ان سفاک ظالم مجرموں سے تمہارے بے گناہ خون کا بدلہ لیتے ہیں۔ تم دیکھتے رہنا اور ہمارے لئے دعا کرتے رہنا۔ وہ وقت قریب ہے جب ان ظالموں سے تمہارے لہو کا انتقام لیا جائے گا اور ان مجرموں کو انصاف کی عدالت میں کھڑا کرکے ان کی سفاکیت اور ظلم کی سزا دلائی جائے گی۔

میں اس تحریر کے ذریعہ ان نام نہاد مسلم حکمرانوں کو یہ بات بتلا دیتا ہوں کہ مذہب اور قوم کے ساتھ غداری کرنے والا کبھی نیک انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔ ماضی کی داستانوں سے عبرت حاصل کریں اور محض چند روزہ عیش وتنعم کے واسطے پوری قوم وملت سے غداری اور خدا کی ناراضگی کا سبب نہ بنیں۔

ہمارے انھیں حکّام کی کمزوری، بزدلی اور اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے کہ آج امت مسلمہ پر ہر چہار سو سے ظلم واستبداد کے ناگ پھن پھیلائے انھیں نگلنے کی کوشش کررہے ہیں اور اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اولاً اپنی قیادت کو مستحکم کرنا ہوگا۔ اور قیادت کی مضبوطی کیلئے اتحاد ضروری ہے۔ آج ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کو مضبوط ومستحکم کرنے کیلئے علماء کرام میدان میں آئیں۔ آرام طلبی کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ اور قوم وملت کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔ کیونکہ

ع یہ دَور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے۔

حالیہ دنوں میں اسی عظیم ترین مقصد کو لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیب وتمدنی ورثے کا امین، اسلام کا مایۂ ناز قلعہ ام المدارس از ہر ہند مادر علمی دارالعلوم دیوبند نے اپنی آغوش محبت وشفقت سے ایک ایسی معنی خیز اور مضبوط تحریک کو وجود بخشا ہے جس نے مسلمانوں کی جانب

دہشت گردی کا اشارہ کرنے والوں کو حیران وششدر اور سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ بلاشبہ اس طرح کی دہشت گردی مخالف کانفرنسوں کے مثبت نتائج اس ملک کے مسلمانوں کے لیے برآمد ہونگے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام دہلی میں منعقد دہشت گردی مخالف کانفرنس سے قبل پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے قائد ملت، جانشین شیخ الاسلام، محدث جلیل حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ نے فرمایا تھا:

''دہشت گردی اور تشدد اسلام کی قیام امن پالیسی سے متصادم ہے، لیکن کچھ شرپسند مفاد پرست عناصر اور مغربی طاقتیں یہ تأثر دینا چاہتی ہیں کہ موجودہ بدامنی اور تشدد کیلئے اسلامی تعلیمات ذمہ دار ہیں۔ اس سازش میں امریکہ پیش پیش ہے۔ صہیونی طاقتیں اور اسلام دشمن عناصر اسلام کی بڑھتی مقبولیت سے اپنے وجود کو خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت جبکہ دنیا کے مختلف خطوں میں امریکی اور مغرب نواز طاقتوں کی دہشت گردی عروج پر ہے ہمارے جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں بہت سے ایسے فرقہ پرست عناصر موجود ہیں جو ملک کے اتحاد و یکجہتی کا شیرازہ بکھیرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ملک کی آزادی کے لئے جس طبقہ کے لاکھوں جیالوں نے تختۂ دار کو چوما اور گلی گلی کوچہ کوچہ اپنا خون بہا کر ملک کو آزاد کرایا ان ہی کو آج ملک دشمن قرار دیا جارہا ہے۔'' (صحافت دہلی ۹/۵/۰۸)

دہشت گردی ایک ناسور ہے جس کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ چونکہ اسلام دشمن عناصر کو اسلام کی بڑھتی مقبولیت سے اپنا وجود خطرہ میں نظر آیا۔ اس لیے انھوں نے دہشت گردی کو اسلام سے جوڑنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ انھوں نے ہدایت کی روشنی کو چھوڑ کر ظلمت و تاریکی کی وادیوں میں بھٹکنا گوارا کرلیا اور دشمنی، ضد اور عناد میں آکر دنیا کو بھی اس منارۂ ہدایت سے محروم رکھ کر چاہِ ضلالت میں رکھنا پسند کرلیا۔

دہشت گردی کا یہ ناسور دنیا کو آہستہ آہستہ اپنی زد میں لے کر تباہی کے دہانے پر پہنچا رہا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کے رہ نماؤں نے اس کی مذمت کی ہے۔ عالمی برادری اپنے اپنے طور پر اس کے تدارک کی کوشش کررہی ہے اس کے باوجود اس میں روز بروز شدت ہی آرہی ہے۔ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اسے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ چسپاں کیا جارہا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کو ہی دہشت گردی کا مذہب کیوں قرار دیا جارہا ہے...؟

بنیادی طور پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام ظلم واستبداد کا مخالف اور عدل وانصاف کا حامی اور سرچشمۂ آب حیات ہے۔اس کا ابتدائی قانون عدل وانصاف کی ترازو میں جبر وتشدد اور شر وفساد کے آہنی پنجوں کو تول کر شروع ہوتا ہے۔انسانیت کا احترام اور حقوق انسانی کی ادائیگی اس کی بلند وبالا تعلیمات میں ہیں۔ یہ زمین پر فساد اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا۔منکرات ومنہیات اور برائیوں سے دور رہنے شرور وفتن سے بچنے اور جرائم کی گرم بازاری سے محفوظ رہنے کی بڑی سختی سے تلقین کرتا ہے اور بار بار قرآنی الفاظ کے ذریعہ لوگوں کو عذاب الٰہی کی گرفت سے ڈراتا ہے۔اور یہی بات کہ اسلام برائیوں سے منع کرکے زر پرستی، مادی ہوس رانی، مال ودولت اور عیش وعشرت کے بے تحاشا پوجا، فحاشی، عریانیت، بے حیائی، بدکاری، جنسی بے راہ روی، جنسی جذبات کو ہوا دینے والے گانوں، فلموں، عریاں تصویروں اور شب وروز برپا ہونے والی محفلوں میں مرد وزن کے بے محابا اختلاط اور جنسی عمل کی مشاقی اور ماورائے ازدواج لڑکوں اورلڑکیوں کے زن وشوہر کی طرح آزادی سے ملنے کی طاقت وَر دعوتوں اور عوامل اور مغربی تہذیب کے روز بروز پیدا ہونے والے فتنوں کے طوفان بلاخیز (ماخوذ) سے بچانے کی بھرپور سعی پیہم کرتا ہے اور ان تمام برائیوں سے روکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا حتیٰ کہ بعض کے ارتکاب سے سزا بھی جومناسب سمجھتا ہے تجویز کرتا ہے تاکہ وہ بھیانک اور خطرناک صورت حال اہل اسلام کی نہ ہوجائے جس کی خطرناک تصویر اور بھیانک صورتِ حال یوروپ کے برے اور گندے لوگوں نے وہاں کے ممالک میں بنا رکھی ہے۔العیاذ باللہ۔امریکہ واسرائیل کے ہم نوا ہونے کی وجہ سے عرب ممالک اور ایشیا میں بھی اس کے گندے جراثیم اپنا قدم جمالینے کی پوزیشن میں ہیں۔

چونکہ آج دنیا میں ہواپرستی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کی وبا عام ہوچکی ہے۔معاشرہ میں برائیوں کا غلبہ اور شر وفساد کا راج ہے۔اور اسلام بیک قلم ان تمام برائیوں اور شرور وفتن کی جڑوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے جسے طاؤس ورباب کی جھنکار پر مچلنے والے، راگ باجے کے دلکش ساز پر تھرکنے والے اور برائیوں کی آغوش کراہت میں زندگی کی رنگ رلیاں منانے والے بے حس اور شقی القلب افراد ناپسند اور خراب سمجھتے ہیں۔کیوں کہ اسلامی تعلیمات کے سبب انھیں برائیوں اور فحاشیوں، عریانیت وبے حیائی اور صنف نازک سے عشرت ومستی کے تمام تر دروازے بند کرنے پڑیں گے اور زندگی کے اس مقام پر پہنچ کر جہاں وہ صرف حسن وعشق کی وادیٔ سرسبز وشاداب میں سیر وتفریح کرتے پھر رہے ہیں۔پارکوں میں بیٹھ کر کسی گل رو پری پیکر سے اپنے دلی

جذبات کی کہانی سنا رہے ہیں۔ ہوٹلوں، قہوہ خانوں اور دیگر تفریح گاہوں میں جاکر وہ اپنے جوش وجذبات کی باگ بے لگام کررہے ہوں، شیطنت کے مراکز فلم ہالوں میں، دنیا کی بدترین جگہ شراب خانوں میں جہاں وہ عیش وطرب کی دنیا آباد کررہے ہوں اور میکدۂ عشق میں جام وساغر چھلک رہے ہوں جن کے نشہ میں چور، عقل سے دور ہوکر یہ لطف اندوز ہورہے ہوں وہاں بھلا اسلام کی تعلیمات کو وہ گوارا کریں گے اور کیا وہ اس مقام کو چھوڑ کر حق کی سچی راہ اپنالیں گے...؟

جامعہ ازہر مصر کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی شامہ اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

''... چونکہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کی تعلیمات نسل انسانی کو لغویات اور جہالت سے نکال کر رشد وہدایت کی روشن راہ پر گامزن کردیتی ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ اگر اسلام کی یہ فکریں مغربی معاشرے میں عام ہوگئیں تو یوروپ کے بازاروں میں لہوولعب کی دکانیں سجائے ہوئے ساہوکاروں کے کاروبار چوپٹ ہوجائیں گے۔ ان کے شراب کے اڈے سنسان اور جوئے وقحبہ خانے ویران ہوجائیں گے۔ غور کیجئے پھر یوروپ میں ان یہودی اور نصرانی کاروباریوں کے روزانہ کی اربوں ملین ڈالر کی آمدنی کا کیا ہوگا...؟ اور کیا یہ مغربی اقوام اس بات کو گوارہ کرسکتی ہے کہ ان فضاؤں میں اسلام متعارف ہو۔ جس کی وجہ سے ان کی دکانیں بند ہوجائیں۔'' (ہندوستان ایکسپریس دہلی ۲۹/۱۱/۲۰۰۷ء)

یہی وہ باتیں ہیں جن کے سبب وہ اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں سے عداوت پر کھل کر اتر آئے ہیں۔ اور جدید ذرائع ابلاغ میڈیا وانٹرنیٹ وغیرہ پر اسلام کو تشدد وبدامنی پھیلانے والا مذہب اور مسلمانوں کو ظالم، جابر اور جاہل اوباش نیز حملہ آور ولٹیرے کہہ کر پورے زور وشور کے ساتھ اس پروپیگنڈے کی تشہیر کی جارہی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شامہ آگے لکھتے ہیں:

''اسلام کی مثبت تعلیمات کو مغربی اقوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کیلئے ایسی تحریک چلائی جارہی ہے جس سے وہاں کے باشندوں میں ایسا پیغام عام ہوجائے کہ وہ اسلام کے قریب بھی پھٹکنا نہ گوارا کریں۔ اسی وجہ سے اسلام کو مذہب امن واخوت کے بجائے نفرت ودہشت قرار دے کر یوروپ وامریکہ میں اس کی تبلیغ کی جارہی ہے۔''

اسلام کو دہشت گردی و بدامنی کی تعلیم دینے والا مذہب ثابت کرنے کی بھیانک سازش رچ لینے کے بعد اس کے اہل کاروں اور نام لیواؤں کے گرد قید و بند اور صعوبتوں کا حصار قائم کردیا گیا۔ ان کو دہشت گرد کہتے ہی دنیا کی ترچھی نگاہیں ان کا تعاقب کرنے لگیں۔ دنیا پر ان کے کیے ہزارہا احسانات کو فراموش کرکے ان کے دینی مدارس اور علماء کرام کی طرف انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ جنھوں نے دہشت و بربریت اور جبر وتشدد کی تلوار کبھی ہاتھ میں نہ لی بلکہ ظلم کی تلوار سے ہمہ آن ذبح کیے جاتے رہے۔ مگر مظلوم ومقہور ہونے کے باوجود حق پر قائم اور انصاف کی راہ پر گامزن رہے۔ اور دنیا کو سکھ چین کا گہوارہ بنانے کی خاطر سدا ظلم کا مقابلہ کرتے رہے۔ انہیں کی گردنوں پر دہشت گردی کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ اور دہشت گردی کے پلڑے میں انہیں ہی تولا جارہا ہے۔

اب ذرا ان کی خانہ تلاشی کی جائے جو دہشت گردی کے خلاف ڈنکے کی چوٹ پر نعرہ لگا کر اس کے مٹانے اور ختم کرنے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دہشت گردی کی یہ خطرناک اصطلاح وضع کرنے والا اور دنیا کے رخ کو اس سمت پھیرنے والا کون ہے...؟ جس نے دہشت گردی کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی سوچ رکھی ہے۔ مگر کفر واسلام، حق و باطل کی متعدد جنگوں میں اسلام کی فتح نے یہ حجت تام کردی ہے کہ یہ خدا کا آخری اور پسندیدہ دین ہے جو مٹنے کے لیے نہیں بلکہ دیگر تمام باطل مذاہب کی بیخ کنی اور لوگوں کے غلط اعتقادات کو مٹانے کیلئے آیا ہے۔ غزوۂ بدر کی پہلی اسلامی جنگ نے یہ ثابت کردیا کہ کفر کے تند و تیز سیلاب اور مہیب طوفانوں کے سامنے اسلام کا تناور پودا پورے تزک واحتشام اور پوری شان وشوکت اور آب وتاب کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور کفر کی بھیانک آندھیاں اس چراغ کو بجھانے کی کوشش میں اپنے ہی نشیمن کی تباہی کا باعث بنیں گی۔

دراصل اسلام کو مٹانے کی سازش کے تحت دہشت گردی کے خلاف عَلَم وآواز بلند کرنے والے یہودی اور عیسائی حکمراں ہی اس کے ''بانی'' اور ''پیشوا'' ہیں۔ چور اپنی چوری چھپانے کی خاطر دوسروں پر چوری کا الزام تھوپنے کی کوشش کرتا ہے مگر مشہور مثل کے مطابق کہ ''چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے'' پکڑا جاتا ہے۔ یہ صرف امکان تک بات نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے اور اس پر بے شمار بیّن دلائل اور پختہ ثبوت ہیں۔ اس لیے ہم پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ ''دہشت گردی کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑنے والے اور دنیا کو دہشت گردی سے پاک کرنے کے

دعوے دار ہی ''اصلی دہشت گرد'' ہیں۔

ورنہ کیا وجہ ہے کہ جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ کر افغانستان میں لاکھوں بے گناہ مردوں عورتوں اور معصوم بچوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تاریخ حقوق انسانی کے منہ کو سیاہ کرکے انسانیت کے سینے میں خنجر گھونپ دیا گیا۔ پھراسی زخم کے قریب عراق میں انسانیت پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ہزاروں لاشیں خاک وخون میں تڑپ کر پیوند خاک ہوگئیں۔مگر اس حملہ کا کوئی سچا ثبوت اور واقعی جواز نہ پیش کیا جاسکا۔صرف تیل کی قدرتی دولت پر قبضہ کی ہوس نے اقوام متحدہ کو اپنے ہاتھوں میں نچا کر انسانی قدروں کو پامال کردیا۔اور اسرائیل کے پٹھو امریکہ نے کشت وخون اور آتش وآہن کا ایسا وحشیانہ کھیل کھیلا جس سے تاریخ کا کلیجہ دہل اٹھا۔

فلسطین میں یہودیوں کی آمد کے ساتھ ہی کشت وخون اور قتل وغارت گری کا وہ بھیانک سلسلہ شروع ہوا جس کی داستان بڑی المناک ہے۔حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی ایک موقع پر لکھتے ہیں:

> ''اس دیار کے اصل مکینوں یعنی فلسطینیوں کو (اسرائیل کی مغرب اور امریکہ کی طرف سے پشت پناہی کی وجہ سے) آفاقی یہودیوں کے ہاتھوں، خانما بربادی،نسل کشی، روز روز کے کشت وخون کے ساتھ ساتھ معاشی بدحالی اور تعلیمی پسماندگی کا جو سامنا رہا اس کی داستان ناقابل بیان حد تک الم انگیز ہے۔ فلسطین میں یہودیوں کو زبردستی لابسانے کی سازش، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ، عالمی طاقتوں کی ہمہ گیر دشمنی کا جلی عنوان تھی۔ عالمی طاقتوں نے اپنے سارے آپسی اختلافات کے باوجود، متحد ہوکر جسم اسلامی میں ایسا گہرا اور کاری زخم لگایا، جو روز اول سے اب تک رس رہا ہے اور نہ معلوم کب تک رستا رہے گا...؟'' (رسالہ دہشت گردی کا عالمی منظر نامہ،ص۴)

لبنان اور چیچنیا میں ہوئے اور ہو رہے ظلم وستم میں بھی انہیں کا ہاتھ ہے اور یہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ہونے والے فسادات اور بم دھماکوں کے دل اندوہ اور وحشت ناک واقعات بھی، انہیں کی پشت پناہی میں سطح زمین سے ابھرتے ہیں اور انسانیت کے سینے میں ایک خوفناک خنجر گھونپ کر تاریخ کے صفحات پر نقش ہوجاتے ہیں۔

اسرائیل اور اس کے پٹھو امریکہ کی یہ اصلی دہشت گردی یقیناً سارے عالم کے لیے

خطرناک ہے، مگر جس فریب کے ساتھ وہ دہشت گردی کا نعرہ بلند کررہے ہیں اور عوام کو بے وقوف بنانا چاہتے ہیں وہ مکاری رفتہ رفتہ سب پر عیاں ہوچکی ہے۔ مگر چور چور کہنے والوں کا یہ ریلہ اس روانی سے بڑھتا آرہا تھا کہ لوگ پہلے سمجھ ہی نہ سکے کہ ہمیں وہمی اور فرضی چور کے پیچھے ہانک کر اصل چور اور حقیقی دہشت گرد سے انہیں دھوکہ میں رکھا جارہا ہے۔

چونکہ اسرائیل کے پٹھو اور اسلام کے دشمن امریکہ نے دہشت گردی کے خاتمہ کیلئے لڑائی لڑنے کے نام پر ''دہشت گردی'' کی اصطلاح کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔ اور دوسروں پر اس کے شکنجوں کو کسنے کے لیے بڑی ہوشیاری اور سنجیدگی سے قدم آگے بڑھایا ہے۔ دہشت گردی کی جو تعریف ہم سمجھتے اور کرتے ہیں یعنی ''دہشت گردی ایسے وسائل کو استعمال کرنا ہے جن کا مقصد سماج میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرنا ہو'' اس اصلی اور حقیقی تعریف کے برعکس امریکہ اور اس کے حواریوں نے دہشت گردی کی تعریف الٹی کی ہے ان کے ذہن کی تخریب کردہ یہ تعریف ہے یعنی ''دہشت گردی ایسے وسائل و ذرائع کا استعمال کرنا ہے جن سے سماج میں امن و امان اور نظامِ اسلام قائم ہو۔'' پس وہ اپنی وضع کردہ اور سوچی سمجھی تعریف کے موافق جن لوگوں کو امن کا کارندہ اور امان قائم کرنے والے وسائل کا استعمال کنندہ پاتے ہیں بلا پس و پیش اسے مجرم بنا کر دہشت گردی کے الزام میں (اپنی بری سوچ کے مطابق) دہشت گردی کے خاتمہ کیلئے اس سے جنگ کرتے ہیں۔ اور اسے مٹا دینے کے ارادے بنا کر اس پر حملہ کردیتے ہیں۔

ان کے نزدیک جو حقیقتاً ظالم اور دہشت گرد ہیں وہ مظلوم اور بیچارے ہیں اور جو واقعتاً مظلوم و معصوم ہیں۔ انصاف کی تلاش میں سرگرداں عدالتوں کا چکر لگاتے پھر رہے ہیں۔ جنھیں طوقِ غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سزا میں آتش و آہن کے ذریعہ کچلا جارہا ہے یعنی فلسطینی اور چیچنیائی مسلمان وغیرہ وہ ''دہشت گرد'' انتہا پسند اور ملک کی سلامتی کیلئے ''خطرہ'' ہیں۔ افسوس کہ ان لوگوں نے

ع خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

الحاصل اسلام، دہشت گردی کو اس کے صحیح اور حقیقی معنی مفہوم میں رکھتے ہوئے نہ تو دہشت گرد مذہب ہے نہ ہی دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسلام دہشت گردی اور ظلم وتشدد کا مخالف اور امن کا علم بردار ہے بلکہ فساد و بگاڑ، ظلم وتشدد اور دہشت گردی کو روکنے اور ختم کرنے کے ہر ممکنہ اسباب اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ حقیقی دہشت گردی سے، اسلام کی طرح دنیا کا نہ

کوئی مذہب لڑا ہے نہ لڑ سکے گا۔ اور دہشت گردی کا وہ امریکی، صہیونی اور صلیبی مفہوم جو یہ ہے کہ ''ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم ہے۔ حق باطل اور ناحق حق ہے اس کے علاوہ جوان کے عزائم کی راہ میں حائل ہو وہ دہشت گردی ہے۔'' اسلام اس مفہوم کی مذمت کرتا ہے اور اس کو بالکلیہ مسترد کرتا ہے۔ کیوں کہ اسلام ظلم کو کسی حالت میں کسی بھی نام اور عنوان سے برداشت نہیں کرسکتا۔

اسلام ہر برائی اور فحش کاری کا مخالف ضرور ہے مگر انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد مذہب ہے۔ اس وقت دنیا میں پھیلی سفاکیت، ظلم و بربریت اور ہر برائی کا خاتمہ اسلام ہی کی تلوارِ امن ومحبت سے کیا جاسکتا ہے۔

آج کے زمانے میں جب کہ ہر صبح طلوع ہونے والا سورج کسی نئی آزمائش اور ہر شام ڈوبتا آفتاب، دہشت گردی کے علم بردار اسرائیل اور امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی نئی سازش کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ اہل اسلام اور فرزندان توحید کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ان کی چالوں سے پردہ ہٹانے والے رجال کار تیار کریں۔ اپنے دفاع کی پوزیشن مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی بے داغ، سچی اور صاف ستھری تصویر دنیا والوں کے سامنے پیش کریں۔ اسلام کا صحیح تعارف کرائیں اور اسلام کو معلوم کرنے، جاننے اور پرکھنے کے خواہش مند افراد اسلام کی حقیقی صورت سے واقف ہوجائیں جو ان کی نگاہوں سے چھپائی جارہی ہے۔ ہمارا کردار اسلام کیلئے عملی نمونہ ہو۔ تاکہ جب لوگ یہ سوال کریں کہ اسلام کیا ہے؟ تو انھیں اس کے تعارف کیلئے کتاب What is Islam? اور وعظ کی ضرورت نہ پڑے۔ بلکہ سوال سے پہلے ہی ہمارے عملی مظاہر دیکھ کر وہ اسلام کو پہچان جائیں۔ اپنے کردار کو کھرا بنانے کے ساتھ ساتھ کھرا ثابت کرنے کیلئے ہمارے پاس آج کے دور میں جدید ذرائع ابلاغ، میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ کی سہولت ہو۔ اپنے حسن اخلاق سے دلوں کو فتح کرنے والے بنیں کہ یہی اسلام کی تعلیم، اسلاف کی تاریخ اور مسلمانوں کی کامیابی کا راز ہے۔

❁ ❁ ❁

درسِ ختمِ بخاری شریف

(۴)

افادات: مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم لندن-یوکے
ترتیب: الیاس لوہاروی (جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل)

دو کلمات کی تین صفات میں سے پہلی صفت

احمد بن اشکاب، محمد بن فُضَیل سے، وہ عُمارَۃ بن القَعْقَاع سے، وہ ابوزُرعہ بَجَلی سے، وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وعنہم سے روایت کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں، کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلٰی الرحمٰن. ''دو کلمے، دو بول رحمٰن کو نہایت محبوب ہیں۔''

آپ نے پڑھا ہے، کہ کبھی کلام پر کلمہ کا لفظ بول دیا جاتا ہے، جیسے کلمۂ شہادت کلام ہے، لیکن اس کو کلمہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ''سُبحانَ اللّٰہِ وبحمدہ'' ایک کلام ہے، اور ''سُبُحَانَ اللّٰہِ الُعظِیم'' دوسرا کلام ہے، لیکن ان دونوں کلام کو ''کَلِمَتَانِ'' یعنی دو کلمے کہا گیا ہے۔

اس حدیثِ پاک میں ان کلمات کی تین صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے، کہ یہ دو کلمے رحمٰن کو نہایت محبوب ہیں۔ یہ دونوں کلمے رحمٰن کو کیوں بہت محبوب اور پیارے ہیں؟ غور کریں! ہر آدمی چاہتا ہے، کہ میری طرف کوئی برائی منسوب نہ کی جائے اور میری طرف خوبی کی نسبت کی جائے۔ جب انسان کو اپنے سے برائی کی نفی اور اپنے لیے خوبی کا اثبات محبوب ہے، تو حضرت رحمٰن کو کیوں نہیں محبوب ہوگا؟ وَلَہُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی. (الروم:۲۷) اللہ تعالیٰ تو اس کے زیادہ حقدار ہیں، اسی لیے ان دونوں کلمات کو پسند فرماتے ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں، کہ ان دو کلمات کے رحمٰن کو محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے، کہ ان کلمات کا پڑھنے والا اللہ کو محبوب ہے۔ اس قول کے اعتبار سے اس میں مَجاز ہے۔

دوسرے علماء فرماتے ہیں، کہ یہاں مجازی معنی مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور حدیثِ پاک کا مطلب یہ ہے، کہ خود یہ دو کلمات اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اس کی تائید

"صحیح مسلم" وغیرہ کی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: ان احبَّ الکلام الی اللہ ان یقولَ العبدُ: سبحانَ اللہ وبحمدہ. "اللہ تعالیٰ کوسب سے محبوب کلام بندے کا سبحان اللہ وبحمدہ کہنا ہے۔" اس حدیثِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا تعلق "سبحان اللہ وبحمدہ" کلمہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور بھی روایات اس کی مؤید ہیں۔ ظاہر ہے، کہ جب حدیث الباب میں منقول دو کلمے رحمٰن کو بہت محبوب ہیں، تو ان کلمات کا پڑھنے والا بھی رحمٰن کومحبوب ہوگا۔ یہ یادرکھیے، کہ رحمٰن کا ان دوکلمات سے یا ان کے پڑھنے والے سے یا دونوں سے محبت کرنا اس کے شایانِ شان ہے، لہٰذا کسی تاویل کی ضرورت رہتی ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے یہاں بطورِ خاص "رحمٰن" کوذکرفرمایا، اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی، کہ حدیثِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کرنے کی جزاء کا بیان ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ عملِ قلیل پر اجرِ جزیل اور ثوابِ کثیر سے نوازتے ہیں، اس اعتبار سے یہ حدیث رحمٰن کی اپنے بندوں پر رحمت کی وسعت کے بیان پر مشتمل ہے، اور اسماءِ حسنیٰ میں سے اس کے مناسب نامِ نامی "رحمٰن" ہے۔

دوسری صفت

جب ان دوکلمات کا نہایت محبوب ہونا اور پیارا ہونا بیان فرمایا، تو کسی کوخیال ہوسکتا تھا، کہ جب ان کا یہ مرتبہ ہے، تو یہ کلمے ادائیگی کے اعتبار سے بہت بھاری ہوں گے، مشقت وکلفت والے ہوں گے، تو آگے دوسری صفت سے اس خیال کی نفی ہوگئی، فرمایا: خَفِیْفَتَانِ علی اللِّسَان. "زبان پر نہایت ہلکے پھلکے ہیں۔" زبان پر ہلکا ہونے سے مراد یہ ہے، کہ ان کا پڑھنا نہایت آسان ہے، ان کی ادائیگی میں کوئی دِقّت و دشواری نہیں ہے، اور زبان سے سہولت اور سلاست سے جاری ہوجاتے ہیں۔

ان کلمات کے ہلکا ہونے کومعلوم کرنے کے لیے عربی کا عبرانی وغیرہ زبانوں کے ساتھ تقابل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کہ یہ کلمات عربی میں ہیں، اور عبرانی وغیرہ زبانوں کے مقابلے میں عربی زبان خفیف ہے، یعنی اس کے کلمات کی ادائیگی نسبتاً آسان ہے؛ بلکہ خود عربی زبان ہی کے اعتبار سے دیکھیں، تب بھی ان کلمات کا "خفیفتانِ علی اللسان" یعنی زبان پر ہلکا پھلکا ہونا واضح ہے، اس لیے کہ اولاً: یہ مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، ان کے حروف کم

ہیں۔اور ثانیاً: عربی میں جوحروفِ شِدّ ۃ معروف ہیں،جن کا مجموعہ ''اجد قط بکت'' ہے،ان میں سے صرف حرف ''بار'' ان کلمات میں ہے۔حروفِ ''استعلار'' جن کا مجموعہ ''خص ضغط قظ'' ہے،ان میں سے صرف ''ظار'' ان میں ہے۔عربی میں ''ثار'' اور ''شین'' ثقیل حروف سمجھے جاتے ہیں، دونوں میں سے کوئی ان کلمات میں نہیں ہے۔ پھر اسمار کے مقابلے میں اَفعال کو ثقیل سمجھا جاتا ہے،اوران کلمات میں کوئی فعل نہیں ہے۔اَسمار میں بھی غیر منصرف کو ثقیل سمجھا جاتا ہے، وہ ان کلمات میں نہیں ہے۔ پھر الف، واواور یار تینوں حروفِ لین ان میں موجود ہیں، جوادائیگی کے اعتبار سے نہایت سہل وآسان ہیں۔الغرض ان کلمات میں شدیداور ثقیل حروف کے مقابلے میں سہل اور ہلکے حروف زیادہ ہیں،اس لیے عجمی سے عجمی شخص بھی انھیں آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔

تیسری صفت

جب یہ دو کلمے زبان پر ہلکے پھلکے ہیں،تو کسی کو خیال ہوسکتا تھا، کہ وزن بھی اسی حساب سے بہت کم ہوگا،اور میزانِ عمل میں بھی ہلکے ہوں گے،تو آگے تیسری صفت سے اس کی نفی ہوگئی،فرمایا: ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ. ''میزان میں بڑے وزن دار ہیں، بہت بھاری ہیں۔'' پاپڑ باریک باریک بنتے ہیں، زبان پر تو وہ ہلکے ہوتے ہیں،مگر ہضم کے اعتبار سے معدے میں بھاری ہوجاتے ہیں، یہ مادّی غذاؤں میں اس کا مصداق ہے۔تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمالِ شریعت میں یہ دو کلمے زبان پر تو ہلکے،لیکن ان کی وجہ سے میزانِ عمل بھاری ہوجائے گی،خودان کلمات کا وزن میزان میں بہت زیادہ ہوگا،اور ظاہر ہے، کہ اس کی وجہ سے ان کلمات کے پڑھنے والے کے اجر وثواب کی بھی کثرت ہوجائے گی۔

مذکورہ کلمات کی یہ فضیلت کیوں؟

ان کلمات کی اتنی فضیلت کیوں ہے اوران میں کیا خاص انوار ہیں؟ اس کا پتہ تو جنت میں جاکر چلے گا،ان شار اللہ۔علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، کہ یوں تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنت میں عظیم نعمتوں سے سرفراز فرمائیں گے،لیکن میری نظر میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے بعد سب سے لذیذ بات یہ ہوگی، کہ اللہ تعالیٰ وہاں ہم پر حقائق اشیار منکشف فرمائیں گے۔ جن امور کا ہمیں یہاں پتہ نہیں چلتا،ان کی حقیقت ہمیں وہاں معلوم ہوجائے گی۔حدیثِ پاک

میں واردان دوکلموں کی اصل حقیقت سے آگاہی بھی جنت میں حاصل ہوجائے گی، ان شاء اللہ۔

تاہم حضرات علماءِ کرام نے منجانب اللہ عطا شدہ فہم سے اس سلسلے میں جو کلام کیا ہے، یہاں اس سے ماخوذ چند اقوال کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں، کہ ان کلمات کے میزان میں ثقیل اور وزن دار ہونے کی بنیاد یہ ہے، کہ ان میں مقاماتِ الوہیت کا بیان ہے۔ "سبحان اللّٰہ" میں مقامِ تنزیہ، "وبحمدہ" میں مقامِ تنویہ وتعریف اور "العظیم" میں مقامِ عظمت کا بیان ہے۔

(۲) شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں، کہ "سبحان اللّٰہ" کے معنی ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے عیب ہے۔ اور "بحمدہ" کا مطلب ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے اندر تمام کمالات جمع ہیں اور وہ تمام تعریفات کے لائق ہیں۔ جو ذات تمام عیبوں سے پاک ہو اور اس میں سارے کمالات جمع ہوں، تو وہ ذات یقیناً سب سے زیادہ محبت کے لائق ہوتی ہے۔ اور "سبحان اللّٰہ العظیم" کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا ذکر ہے۔ اور جب کسی ذات کی عظمت اور جلال کا ذکر کیا جائے، تو اس کا خوف دل میں آتا ہے۔ "سبحان اللّٰہ وبحمدہ" سے اللہ تعالیٰ کی ''محبت'' پیدا ہوئی، اور "سبحان اللّٰہ العظیم" سے اللہ تعالیٰ کا ''رعب'' پیدا ہوا۔ جب محبت اور رعب یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوجاتی ہیں، تو اس کا نام ''خشیت'' ہے۔ خشیت عام ڈر اور خوف کا نام نہیں؛ بلکہ اس ڈر کا نام ہے، جو کسی محبت کی وجہ سے پیدا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ سے خشیت سارے اعمال واخلاق کی اساس اور سارے علوم کا حاصل ہے۔

(۳) محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری مدظلہم فرماتے ہیں، کہ ان کلمات کے میزان میں بڑے وزن دار ہونے کی علّت ان دونوں کلموں کا رحمٰن کو محبوب ہونا ہے۔ رحمٰن کو محبوب ہونے کی وجہ سے ان کا وزن بڑھ گیا۔ اور یہ دونوں کلمے رحمٰن کو محبوب کیوں ہیں؟ اس کی وجہ ماقبل میں بیان ہوچکی۔

موضعِ ترجمہ

"ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ" موضعِ ترجمہ: محلِّ ترجمہ ہے۔ اسی سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے، کہ بنو آدم کے اعمال واقوال تولے جائیں گے، کیوں کہ اس میں

ان دوکلمات کے میزان میں ثقیل ہونے کی تصریح ہے، اور کسی چیز کا بھاری یا ہلکا ہونا تولنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا، کہ وہ تولے جائیں گے۔ اور کلام عمل لسان ہے۔ جب انسان کے بعض اعضاء کے عمل کا تولنا ثابت ہوگیا، تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سے سارے اعضاء کے عمل کو تولنے کو ثابت کردیا۔

حدیثِ مذکور میں سَجع

حدیثِ پاک میں آپ نے دیکھا، کہ مُسَجَّع و مُقفّٰی کلام کیا گیا ہے، ان جملوں کے آخری الفاظ بلارعایت وزن ہم قافیہ ہیں: کلمتان حبیبتان إلی الرحمٰن، خفیفتان علی اللسان، ثقیلتان فی المیزان. لیکن یہ سَجعِ مذموم کے قبیل سے نہیں ہے۔ یہ پُرلطف وشیریں مسجّع کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے بلاتکلف صادر ہوا ہے۔ سَجعِ مذموم وہ ہے، جس میں تکلف کا دخل ہو، یا جو کسی باطل بات کو متضمن ہو۔

ترکیبی بحث

"کَلِمَتَان حَبِیْبَتَان..." اور "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ..." ترکیب میں کیا واقع ہے؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے "منحۃ الباری" میں اختصار کے ساتھ اور علاّمہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "إرشاد الساری" میں قدرے تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے۔ مختصراً سنیے:

(۱) عامّۃ الشّراح رحمہم اللہ فرماتے ہیں، کہ "کَلِمَتَان" اپنی تینوں صفتوں: (۱) حَبِیْبَتَان إلیٰ الرحمٰن (۲) خَفِیْفَتَان عَلیٰ اللِّسَان اور (۳) ثَقِیْلَتَان فِی الْمِیْزَان کے ساتھ مل کر خبر مقدم ہے، اور "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم" مبتدأ مؤخر ہے۔ علم معانی میں پڑھ لیا ہے، کہ کبھی خبر کو مبتدأ پر اس لیے مقدم کیا جاتا ہے، کہ سامع کو مبتدأ کی تشویق ہو، اور اس کی وجہ سے وہ اوقع فی النفس ہو۔ یہاں اسی غرض سے خبر کو مقدم اور مبتدأ کو مؤخر لایا گیا ہے۔

(۲) محقق کمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو راجح قرار دیا ہے، کہ "کَلِمَتَانِ" اپنی تینوں صفتوں سے مل کر مبتدأ ہے، اور "سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم" خبر ہے۔ اس لیے کہ "سبحان اللّٰہ..." لفظاً مؤخر ہے، اور اصل یہی ہے، کہ لفظ کو بلا کسی قوی داعیہ کے

اپنے محل سے ہٹایا نہ جائے، اور مبتدأ کا محل پہلے اور خبر کا محل اس کے بعد ہے۔ نیز "سبحان اللّٰہ..." خود محل فائدہ ہے۔ بخلاف "کلمتان" کے، کہ وہ بذاتِ خود محل فائدہ نہیں ہے؛ بلکہ اپنی صفات کے واسطے سے محل فائدہ بن رہا ہے۔ اور جو بذاتِ خود محل فائدہ ہو، اسے خبر قرار دینی چاہیے۔ یہ امر بھی "سبحان اللّٰہ..." کے خبر ہونے کا متقاضی ہے۔

"سبحان اللّٰہ" کے معنی

رحمٰن کو نہایت محبوب، زبان پر بہت ہلکے پھلکے اور میزانِ عمل میں بڑے وزن دار کلمات یہ ہیں: "سُبُحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمُدِہ، سُبُحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیُم".

"سُبُحَانَ اللّٰہ" کے معنی ہیں: ''میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں۔'' پاکی بیان کرنے کے معنی یہ ہیں، کہ میں اس بات کا اقرار واعلان کرتا ہوں، کہ اللہ تعالیٰ نقائص ومعائب سے منزہ ومبرّا ہے، اس کی ذاتِ عالی بے عیب ہے۔ اسی کو ''تنزیہ'' کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر عیب سے منزہ قرار دینا۔ اللہ تعالیٰ شانہ تو ازازل تا ابد ایسی چیزوں سے پاک اور منزہ ہیں، جو اس ذاتِ والا شان کے لائق نہیں، چاہے کوئی اس کی پاکی اور بے عیب ہونا بیان کرے یا نہ کرے، لیکن بندہ "سبحان اللّٰہ" کہہ کر خود کو ان لوگوں میں شامل کر رہا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بے عیب اور پاک ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ بندے کے تسبیح پڑھنے اور پاکی بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ پاک نہیں ہوتے، العیاذ باللہ؛ بلکہ بتصریح نصوص خود بندہ اپنے گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ "کتاب الدعوات" میں روایت گزری ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من قال: سُبُحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمُدِہٖ فِیُ یَوُمٍ مائة مرةٍ، حُطّتُ (عنه) خَطَایَاہُ، وَاِنُ کَانَتُ مِثُلَ زَبَدِ الُبَحُرِ. ''جو دن میں "سُبُحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمُدِہ" سو بار پڑھ لے، اس کے سارے خطایا معاف ہوجائیں گے، اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔'' یہاں ''جزاء من جنس العمل'' کا قانون کارفرما ہے، جیسا عمل ویسا ہی بدلہ۔ جب بندہ اپنے رب سے نقائص ومعائب کی نفی کرتا ہے، تو ربّ العالمین جو اکرم الاکرمین ہیں، اپنی طرف سے یہ بدلہ دیتے ہیں، کہ اپنے بندے سے نقائص ومعائب کو دھودیتے ہیں، اس کے گناہوں کو معاف کردیتے ہیں، اس اعتبار سے اس میں خود بندہ کا اپنا نفع ہے۔

من نگردم پاک از تسبیح شاں
ہم ایشاں پاک شوند و درخشاں

قرآن مجید میں رسولِ اکرم ﷺ، دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام، حضرات ملائکہ، مؤمنین، حیوانات وجمادات اور جمیع موجودات سے متعلق کم وبیش (۳۰) صورتوں سے تسبیح کا ذکر آیا ہے، کہیں "سُبْحانَ" کا لفظ ہے، تو کہیں "سَبِّحْ" بفعلِ امر۔ کہیں "سَبَّحَ" بفعلِ ماضی ہے، تو کہیں "یُسَبِّحُ" بفعلِ مضارع۔ آخر کوئی تو بات تھی، کہ فتح مکہ جو عظیم ترین فتح تھی، جو درحقیقت سارے عرب کی فتح تھی، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں سے متعلق کوئی اہم پیغام رسول اللہ ﷺ کو نہ دیتے ہوئے تسبیح وتحمید کے اہتمام کی تلقین فرمائی۔

وَبِحَمْدِهٖ

"وَبِحَمْدِهٖ" میں اللہ تعالیٰ کے لیے خوبیوں اور کمالات کا اثبات ہے۔ اس میں اختلاف ہے، کہ یہاں "واؤ" کونسا ہے اور "باء" کونسی ہے؟ چند اقوال سن لیجیے:

(۱) "واؤ" عاطفہ ہے اور "باء" سببیہ ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اُسَبِّحُ اللّٰہَ تَعَالٰی تَسْبِیْحًا وَاُثْنِیْ عَلَیْهِ بِسَبَبِ حَمْدِهٖ. "میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی ثناء کرتا ہوں، اس لیے کہ اس نے اپنی حمد وتعریف کی ہے۔"

(۲) "واؤ" عاطفہ ہے اور "باء" استعانت کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اُسَبِّحُ اللّٰہَ تَعَالٰی تَسْبِیْحًا بِمَعُوْنَتِهِ الَّتِیْ هِیَ نِعْمَةٌ تُوْجِبُ عَلَیَّ حَمْدَهٗ. "میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں، لیکن اپنی قوت وطاقت سے نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے، جو ایک ایسی نعمت ہے، جو مجھ پر اس کی حمد وثناء کو واجب کرتی ہے۔"

(۳) "واؤ" عاطفہ ہے، "باء" ملابست کے لیے ہے اور "حمد" کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اُسَبِّحُ اللّٰہَ تَعَالٰی وَاَتَلَبَّسُ بِحَمْدِهٖ اَیْ بِتَوْفِیْقِهٖ. "میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور میرا اس کی پاکی بیان کرنے میں لگنا اس کی توفیق سے ہے۔"

(۴) "واؤ" عاطفہ ہے، "باء" ملابست کے لیے ہے اور "حمد" کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اُسَبِّحُ اللّٰہَ تَعَالٰی وَاَتَلَبَّسُ بِحَمْدِهٖ. "میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی تعریف کرنے میں لگا ہوں۔"

(۵) "واؤ" حالیہ ہے، اور "باء" ملابست کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اُسَبِّحُ اللّٰہَ تَعَالٰی تَسْبِیْحًا مُتَلَبِّسًا بِحَمْدِهٖ. یعنی جس وقت میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں، ٹھیک اسی

وقت میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بھی کر رہا ہوں، جب اللہ تعالیٰ سے عیوب ونقائص کی نفی کی گئی، تو کوئی کہہ سکتا تھا، کہ اللہ تعالیٰ کی علوِّ شان کے لحاظ سے یہ تعریف بہت کم ہوئی۔ اتنے بڑے کمالات کے ہوتے ہوئے صرف یہ کہنا کہ اس میں عیوب نہیں ہیں، یہ ایسا ہے۔

شاہ را گوید کسے جُلا ہا نیست
ایں نہ مدح اوست مگر آگاہ نیست

''بادشاہ کے متعلق کوئی کہے، کہ یہ جُلاہا نہیں ہے، کپڑا بننے والا نہیں ہے، تو یہ اس کی تعریف نہیں ہے، مگر کہنے والا اس حقیقت سے بے خبر ہے۔''

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں صرف یہ کہہ دیا جاتا، کہ اس کی ذات میں کوئی عیب نہیں، تو یہ کم درجہ کی تعریف ہوتی، اگرچہ بعد میں یہ بھی کہہ دے، کہ ''میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں۔'' گویا اس بات کو گوارا نہیں کیا گیا، کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کو بے عیب کہا جائے، اس وقت اس کی صفاتِ کمال کا ذکر نہ کیا جائے، اس لیے واوٴ حالیہ کے ساتھ کہا گیا: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ. جس وقت میں اللہ تعالیٰ سے عیوب ونقائص کی نفی کرتا ہوں، عین اسی وقت میں اس کی حمد کرتا ہوں، اس کے لیے کمالات کا اثبات کرتا ہوں۔

صفاتِ باری تعالیٰ کی دو قسمیں

باری تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں: (۱) صفات عدمیہ یا سلبیہ۔ ان کو ''صفاتِ جلال'' کہا جاتا ہے۔ (۲) صفاتِ وجودیہ یا ثبوتیہ۔ ان کو ''صفاتِ اکرام'' کہا جاتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ذوالجلال والإکرام﴾ (الرحمٰن: ۲۷) سے ماخوذ ہے۔

صفاتِ عدمیہ: جلال سے مراد وہ صفات ہیں، جن کے ذریعہ باری تعالیٰ کی عیوب ونقائص سے پاکی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً: اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی کوئی بیوی اور اولاد نہیں ہے، وغیرہ۔

صفاتِ وجودیہ: اِکرام سے مراد وہ صفات ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے کمال وعظمت پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً: وہ زندہ ہیں۔ وہ قادر ہیں۔ وہ خالق ہیں، وغیرہ۔

''سبحان اللّٰہ'' میں صفاتِ جلال کی طرف اشارہ ہے اور ''وبحمدہ'' میں صفاتِ اِکرام کی طرف اشارہ ہے۔

پاکی بیان کرنے میں کسی خاص عیب ونقص کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح تعریف میں کسی خاص کمال کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اس سے عموم مستفاد ہوتا ہے، کہ میں تمام نقائص سے پاکی بیان کرتا ہوں اور سارے کمالات پر تعریف کرتا ہوں۔

''سبحان اللہ'' کو ''وبحمدہ'' پر مقدم کیوں کیا گیا؟

اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی عظمت کا اقرار تقریباً تمام اقوام کرتی تھیں؛ البتہ مِلل واقوام میں جو اختلافات یا گمراہی کے تصورات تھے، وہ صفاتِ عدمیہ: صفاتِ جلال میں نسبتاً زیادہ تھے۔ اس لیے زیادہ اہم بات یہ تھی، کہ پہلے شوائبِ نقص وعیب سے ذاتِ باری تعالیٰ کی پاکی و برتری کا اظہار کیا جائے، اس کے بعد اس کی عظمت وکمال کا اقرار کیا جائے، اس لیے ''سبحان اللّٰہ'' کو مقدم کیا گیا اور اس کے بعد ''وبحمدہ'' کو ذکر کیا گیا۔ مشہور ہے: التخليةُ مقدمةٌ على التحلية.

''سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْم''

آگے دوسرا کلمہ ہے ''سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْم''. ''میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں، جو بڑی عظمت والا ہے۔''

''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' کو دوبارہ ذکر کرنے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ چند یہ ہیں:

(۱) تاکید مقصود ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی طرف عیوب ونقائص منسوب کرنے والوں: مشرکین کی کثرت کا لحاظ کرتے ہوئے صیغۂ تنزیہ: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' کو مکرر لایا گیا۔

(۳) اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے عیوب ونقائص سے پاک ہونے کا ادراک تو عقل سے بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا اس کے اقرار سے باز نہیں رہنا چاہیے، نہ کوتاہی کرنی چاہیے۔ ہاں! کمالات کا معاملہ دوسرا ہے، عقل ان کے حقائق کے ادراک سے قاصر ہے۔

سنیے! ظاہر الفاظ کی طرف نظر کرتے ہوئے ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' مکرر ہے اور ''بحمدہ'' میں تکرار نہیں ہے، ورنہ درحقیقت جو مضمون ''سبحانَ اللّٰہ وبحمدہ'' میں بیان ہوا ہے، اسی کو یہاں ''سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْم'' سے ادا کیا گیا ہے، کیوں کہ ''العظیم'' کے معنی ہیں: بڑائیوں والا۔ بڑائیوں والا اور عظمت کاملہ والا وہی ہے، جو تمام خوبیوں کا جامع ہو۔ یہی ''بحمدہ'' کا مطلب ہے۔

ان کلمات کی فضیلت کے پیش نظر ان کو پڑھتے رہنے میں آدمی کو دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ کم ازکم دن میں سو بار پڑھ لے۔ ان کے پڑھنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ اس میں ہے ہی کیا؟ دو ہی تو کلمے ہیں۔ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے "جامع العلوم والحکم" میں ذکر کیا ہے، کہ امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا عام وردیہی دو کلمے تھے۔ ہم بھی ان کلمات کو حرزِ جاں اور وردِ زباں بنالیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

براعتِ اختتام

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس "جامع" کی کتابوں میں سے ہر کتاب کے آخر میں عامتاً اس کا اہتمام فرماتے ہیں، کہ حدیث میں یا اس پر کلام میں ایسا کلمہ ہو، جس سے اس کتاب کے ختم کی طرف اشارہ ہو۔ اختتام پر تسبیح مشروع ہے۔ چناں چہ حدیثِ پاک میں ہے: مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا كَثُرَ فيه لَغَطُه، فقال قبلَ أن يقومَ من مجلسه ذلك: سبحانك اللّٰهم وبحمدك، اشهدُ أن لا إله الاّ أنت، استغفرُكَ واتوبُ اليك، إلا غفر اللّٰهُ له ما كان في مجلسِه ذلك. "جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا، جس میں اس سے بہت سی قابل مؤاخذہ فضول باتیں سرزد ہوئیں، پس اس نے اس مجلس سے اٹھتے وقت کہہ دیا: "سبحانك اللّٰهم وبحمدك، اشهدُ أن لا اله إلاّ أنت، استغفرُكَ واتوبُ إليك. تو اللہ تعالیٰ اس مجلس میں اس سے سرزد ہونے والی سب لغزشوں کو معاف فرمادیں گے۔" یہ مضمون پندرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، بعض سے مرفوعاً اور بعض سے موقوفاً مروی ہے۔ اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تسبیح پر "کتاب التوحید" کو ختم فرمایا۔ نیز تسبیح کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد اہل جنت کی اخیر بات ہوگی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿دعوٰهم فيها سبحٰنك اللّٰهم وتحيتهم فيها سلٰم واٰخر دعوٰهم ان الحمد الله رب العلمين﴾ (یونس: ۱۰) "اہل جنت کے منھ سے یہ بات نکلے گی، کہ سبحان اللہ اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا: السلام علیکم اور ان کی (اس وقت کی باتوں میں) اخیر بات یہ ہوگی: الحمد لله رب العالمين". "کتاب التوحید" کی اس آخری حدیث پاک میں بھی تسبیح کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد آگئی۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کی رائے یہ ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہر کتاب کے آخر میں آدمی کو: قاریٔ کتاب کو اس کی موت یاد دلاتے ہیں۔ اور یہ اس

آخری باب سے بالکل ظاہر ہے، اس لیے کہ اس سے مقصود وزنِ اعمال کا اثبات ہے اور وزن مرنے کے بعد قیامت کے دن ہوگا۔

احمد بن اشکاب والی روایت آخر میں لانے میں نکتہ

یہ روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "صحیح" میں کل تین مقامات میں ذکر فرمائی ہے۔ایک "کتاب الدعوات" میں، دوسرے "کتاب الأیمان والنذور" میں اور تیسرے یہاں آخر کتاب میں۔ "کتاب الدعوات" میں زُہَیر بن حَرب، "کاتب الأیمان والنذور" میں قُتَیبۃ بن سعید اور یہاں احمد بن اشکاب کی سند سے ذکر کی ہے۔خاتمۃ الکتاب میں احمد بن اشکاب کی روایت لانے میں کیا نکتہ ہے؟

(۱) بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت اپنے ان تینوں شیوخ میں سے احمد بن اشکاب سے سب سے آخر میں سنی تھی، اس لیے اس کو آخر میں لائے۔

بندہ کہتا ہے، کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں یہ تو ہے، کہ قال البخاري: آخِرُ مَا لَقِیتُه بِمِصْرَ سَنَةَ سَبْعَ عَشَرَةَ. ''امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، کہ احمد بن اشکاب سے میری آخری ملاقات مصر میں ۲۱۷ھ میں ہوئی۔'' لیکن یہ بات نہ مل سکی، کہ ان تینوں شیوخ میں سے احمد بن اشکاب سے یہ روایت آخر میں سُنی تھی۔اور ظاہر ہے، کہ "آخِرُ مَا لَقِیتُه بِمِصْرَ سَنَةَ سَبْعَ عَشَرَةَ" سے یہ مطلب اخذ نہیں ہوسکتا۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) "صحیح بخاری" کی پہلی حدیث "إنما الأعمالُ بالنیات" کے راوی ''حمیدی'' ہیں، اور اس آخری حدیث کے تین شیوخ میں سے ایک ''احمد بن اشکاب'' ہیں۔ ''حمیدی'' اور ''احمد'' دونوں کا مادہ ''حمد'' ہے۔گویا لطیف پیرایہ میں ﴿له الحمد في الأولیٰ والآخرة﴾ (القصص: ۷۰) کی طرف اشارہ ہے۔زُہیر یا قُتیبۃ کی روایت یہاں ذکر کرنے میں یہ نکتہ حاصل نہ ہوتا۔

مذکورہ حدیث پر کتاب ختم کرنے کی وجوہ

حضرات علماءِ کرام نے اس حدیث پر کتاب ختم کرنے کی متعدد وجوہ وحکم ذکر کی ہیں، ان

میں سے چند یہ ہیں:

(۱) علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ اواخر مجلس میں تسبیح مندوب ہے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو مجلس علم ٹھہرا کر اسے تسبیح پر ختم فرمایا۔

(۲) علامہ محمد تاودی مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”بدء الوحی“ سے کتاب کا آغاز فرمایا، اور مکمّل سورت کی آخری وحی ”سورۂ نصر“ کی وحی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کی خبر ہے۔ اس وحی میں ”فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ“ (النصر: ۳) فرمایا گیا ہے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تسبیح وتحمید کی فضیلت کی حدیث پر اپنی کتاب کو ختم کیا۔

(۳) شیخ الاسلام زکریا الانصاری اور علامہ قسطلانی رحمہما اللہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو اس حدیث پر اس لیے ختم فرمایا، تاکہ مقامِ رجاء وخوف کو جمع کریں، کیوں کہ ”الرحمن“ کے معنیٰ ”انعام“ کی طرف راجع ہیں۔ اور ”العظیم“ ہیبت الٰہیہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کے معنیٰ ”خوف“ کی طرف راجع ہیں، تو ذاکر جمیع احوال میں بمصداق آیت قرآنیہ ﴿یرجون رحمته ویخافون عذابه﴾ (الإسراء: ۵۷) خائف وراجی: ڈرنے والا اور امیدوار رہو اور یہی مقتضاءِ ایمان ہے۔

(۴) شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئ عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں، کہ ”سبحان اللّٰه وبحمده“ سے اللہ تعالیٰ کی صفت جمال کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے عیب ہے اور تمام محامد کی جامع ہے۔ اور قابل تعریف ذات وہ ہوتی ہے، جس میں جمال ہو، لہٰذا یہ جملہ صفت جمال کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ اور دوسرا جملہ ”سبحان اللّٰه العظیم“ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ باری تعالیٰ کے جمال کے تصور سے ”محبت“ پیدا ہوتی ہے اور جلال کے تصور سے ”خوف“ پیدا ہوتا ہے۔ اور ”محبت“ اور ”خوف“ دونوں کے ملنے کے نتیجے میں ”خشیت“ پیدا ہوتی ہے، تو اس حدیث کو اس لیے بالکل آخر میں لائے، کہ سارے اعمال واخلاق کی اساس اور تمام علوم کا خلاصہ ”خشیت اللہ“ ہے، اسے اپنے اندر پیدا کرو۔

(۵) محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری مدظلہم فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے اختتام پر تسبیح وتحمید پر مشتمل حدیث لاکر تکفیر سیئات والے اعمال

کا اہتمام کرنے اور دارالحمد یعنی جنت کے لیے تیاری کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں، کہ آپ نے کتاب پوری کرلی، علم دین سے واقف ہوگئے، اب عمل کی طرف توجہ کیجیے، تاکہ "دار الحمد" آپ کا مستقر بنے۔

(۶) علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تسبیح پر مشتمل حدیث پر اپنی کتاب کو ختم فرمایا ہے، تاکہ حدیث نبوی "مَنْ كَانَ آخرُ كلامِه لا إلٰهَ إلا الله دَخَلَ الجنّةَ". (جس کا آخری کلام "لا إله إلا الله" ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا) کی رعایت ہوجائے، کیوں کہ تسبیح کی حقیقت، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ ہے، کہ شریک، بیوی اور اولاد وغیرہ ایسی چیزوں سے اللہ تعالیٰ کو منزہ قرار دینا، جو اس کی ذاتِ عالی کے لائق و مناسب نہیں ہے۔ اس اعتبار سے تسبیح بدرۂ اتم توحید کے معنی کو ادا کرنے والی ہے۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس ختم میں اس کتاب کی طرف اعتناء کرنے والوں کے حق میں توحید پر خاتمہ کی نیک فالی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ بھی توحید پر فرمائے، آمین۔

پہلی اور آخری حدیثوں میں مناسبات

اب آخر میں "صحیح بخاری" کی پہلی اور آخری حدیثوں میں مناسبت کے بارے میں چند اقوال سن لیجیے۔ ویسے تو دونوں حدیثوں میں مناسبت کے سلسلے میں کئی نکتے بیان ہوئے ہیں، جن میں سے بعض اشکال سے خالی نہیں۔

(۱) علامہ ناصرالدین ابن المنیر رحمۃ اللہ علیہ "المتواری" میں فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کے فاتحہ اور خاتمہ میں آدابِ سنت کا لحاظ رکھا ہے۔ ابتداء میں ادب یہ ہے، کہ قصد و نیت میں اخلاص ہو، تو حدیث "إنما الأعمال بالنيات" سے شروع فرمایا۔ اور اختتام مجلس پر رسول اللہ ﷺ نے تسبیح کی ترغیب دی ہے، اس پر عمل کرتے ہوئے تسبیح پر ختم فرمایا ہے۔

(۲) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں، کہ حدیث اول میں ''مقاماتِ عبدیت'' کا بیان ہے۔ عبد کا کام یہ ہے، کہ نیت سے بھی اس کی طرف رجوع کرے، اور عمل سے بھی اس کی طرف رجوع کرے۔ اور اخیر حدیث میں ''مقامات

الوہیت'' کا بیان ہے۔ ''سبحان اللّٰہ'' میں ''مقامِ تنزیہ''، ''وبحمدہ'' میں ''مقامِ تنویہ و تعریف'' اور ''العظیم'' میں ''مقام عظمت'' کا بیان ہے۔

(۳) ''صحیح بخاری'' کی پہلی حدیث ''غریب'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کو نقل کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ متفرد ہیں، صحت کے ساتھ یہ روایت ان کے علاوہ کسی اور سے مروی نہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے میں علقمہ بن وقّاص لَیثی، ان سے روایت کرنے میں محمد بن ابراہیم تیمی اور ان سے روایت کرنے میں یحییٰ بن سعید متفرد ہیں۔

اسی طرح ''صحیح بخاری'' کی یہ آخری حدیث بھی ''غریب'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کو نقل کرنے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ متفرد ہیں۔ ان سے روایت کرنے میں ابوزُرعۃ، ان سے روایت کرنے میں عُمارۃ بن القَعْقاع اور ان سے روایت کرنے میں محمد بن فُضیل متفرد ہیں۔

علامہ محمد تاودی مالکی رحمۃ اللہ علیہ نکتہ بعد الوقوع کے طور پر فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے غریب حدیث سے کتاب کا آغاز کیا، اور غریب حدیث پر ختم فرمایا، جیسے ''اسلام'' کے بارے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا: بَدَأَ الاسلامُ غریباً وسَيَعُودُ غَرِيبًا.

''نوادر الحدیث'' میں نکتہ بعد الوقوع ہی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ متعلّم کو تنبیہ فرمارہے ہیں، کہ طلب علم کے لیے غریب الوطنی اختیار کرے۔ یا آخرت کو یاد دلاتے ہیں، اس لیے کہ مردہ گورستان میں غریب الوطن کے طور پر ہوتا ہے۔

میں اپنی بات اسی پر ختم کرتا ہوں۔ دعا ہے، کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس باب اور حدیث سے حاصل ہونے والے تمام اسباق پر عمل کرنے کی توفیق کامل عطا فرمائے، آمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى وَسَلَّمَ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْن. وآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن.

❁ ❁ ❁

تیسری اور آخری قسط

پڑوسی کے حقوق

از: محمد عظیم فیض آبادی

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے خود اپنا ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ ''۱۹۶۳ء میں جب میں سعودی عرب گیا تو وہاں کے ایک باشندے نے مجھے اپنا واقعہ خود سنایا کہ ایک مرتبہ میں کپڑا خریدنے کے لیے بازار گیا ایک دکان میں داخل ہوکر بہت سے کپڑے دیکھے دکاندار پوری خوش اخلاقی سے مجھے مختلف کپڑے دکھاتا رہا بالآخر میں نے ایک کپڑا پسند کرلیا دکاندار نے مجھے قیمت بتادی میں نے دکاندار سے کہا کہ مجھے یہ کپڑا اتنے گز کاٹ دو۔ وہ دکاندار ایک لمحہ کے لئے رکا اور اس نے مجھ سے کہا آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا جی ہاں اس نے کہا قیمت بھی آپ کی رائے میں مناسب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اس پر اس نے کہا اب آپ میرے برابر والی دکان پر چلے جایئے اور وہاں سے یہ کپڑا اسی قیمت پر لے لیجئے، میں بڑا حیران ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ میں اس دکان پر کیوں جاؤں میرا معاملہ تو آپ سے ہوا ہے کہنے لگا کہ آپ کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو کپڑا چاہئے وہاں موجود ہے اور آپ کو اسی قیمت میں مل جائے گا جاکر وہاں سے لے لیجئے میں نے کہا پہلے وجہ بتائیں کیا وہ آپ ہی کی دکان ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ اب میں بھی اڑ گیا اور میں نے اصرار کیا کہ جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے میں اس دکان پر نہیں جاؤں گا۔ آخر کار اس نے .....ہوکر کہا کہ آپ خواہ مخواہ بات لمبی کررہے ہیں بات صرف اتنی ہے کہ میرے پاس صبح سے اب تک بہت سے گاہک آچکے ہیں اور میری اتنی بکری ہوچکی ہے کہ میرے لئے آج کے دن کے حساب سے کافی ہوسکتی ہے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا پڑوسی دکاندار صبح سے خالی بیٹھا ہے اس کے پاس کوئی گاہک نہیں آیا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی بھی کچھ بکری ہوجائے آپ کے وہاں جانے سے اس کا بھلا ہوجائے گا آپ کا اس میں کیا حرج ہے''؟

یہ اس اسلامی معاشرے کی ایک بچی جھلک تھی جس میں مسرت وکامیابی محض پیسوں کی گنتی کا نام نہیں تھا بلکہ روح کے اس سکون اور قلب وضمیر کے اس اطمینان کا نام تھا جو اپنے کسی بھائی بہن کا دکھ دور کرنے یا اس کے چہرے پر مسکراہٹ لاکر حاصل ہوتا ہے۔

مذہب اسلام نے پڑوسیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی جابجا تاکید کی ہے حتی کہ تھوڑی دیر کے پڑوسی یعنی تھوڑی دیر کے ساتھی کے ساتھ بھی حسن سلوک اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنے کی ترغیب دی ہے جیسا کہ سفر وغیرہ میں یہ مواقع پیش آتے ہیں جن کو عموماً پڑوسی اور ہمسایہ تصور ہی نہیں کیا جاتا، اس کے حقوق کی رعایت، اس کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاشرت کا بالکل بھی خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ اس کو بھی ہمسایہ و پڑوسی کی طرح قربت وصحبت اور ساتھ رہنے سہنے کا اتفاق ہوتا ہے جیسا کہ سفر کے ساتھی کارخانہ کے ملازم، دوکان کے دوشریک اور اسی طرح طالب وشاگرد وغیرہ، یہ بھی ایک طرح کے پڑوسی ہیں اگرچہ ان کے ساتھ ہمسائیگی دائمی نہیں ہوتی اس کا نام صحبت و رفاقت بھی رکھ سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے جہاں رشتہ داروں، ہمسایوں، یتیموں، اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم وترغیب دی وہیں تھوڑی دیر کے ساتھی کے ساتھ کا بطور خاص ذکر فرمایا، چونکہ انسان عموماً ایسے ساتھی کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آنے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا بہت کم خوش نصیب ایسے ہیں جو ان مواقع پر اپنے ساتھی کے حقوق کا خیال رکھتے اور اسکی راحت رسانی پر آمادہ ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے ایسے لوگ عموماً اجنبی اور بے گانہ ہوتے ہیں اور ان سے جدائی کے بعد دوبارہ اس ملاقات کی امید اور کوئی واسطہ نہیں پڑتا اس وجہ سے اگر ان کے ساتھ کوئی بداخلاقی اور ناروا سلوک اور اس کے ساتھ کچھ دل آزاری کا معاملہ پیش آگیا تو کسی دیرپا بدنامی اور رسوائی کا اندیشہ نہیں ہوتا اس وجہ سے لوگ سفر میں ریل، بس ہوائی جہاز وغیرہ، اور اسی طرح دیگر مجالس و پروگراموں اور کارخانوں میں اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے کہ دیگر حضرات کو اس کے کس عمل وکردار سے ایذاء و تکلیف پہنچی حالانکہ بدزبانی و بداخلاقی سے پیش آنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے حدیث شریف میں ہے "مَنْ بَذَا جَفَا" جس نے بدزبانی کی اس نے ظلم کیا۔ (حاتم) بدزبانی یقیناً ظلم ہے دوسروں پر بھی اور خود اپنے نفس پر بھی کیونکہ بدزبانی و بداخلاقی دوستوں اور خیرخواہوں سے محروم کردیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں خوش خلقی اور رحم دلی ایک ایسا محمود ومحبوب وصف ہے جو غیروں کو بھی اپنا بنادیتی ہے۔ مخلوقِ خدا کے ساتھ رحم دلی اور نرمی کا برتاؤ اللہ رب العزت کو بہت

پسند ہے اس کے برعکس اگر کوئی بوقت ضرورت بھی لوگوں پر رحم نہ کرے تو یہ خدا کی ناراضگی کا باعث ہے اور اللہ تعالیٰ خود بھی اس پر رحم نہیں کرتے "مَنْ لَا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ" جو دوسروں پر رحم نہ کرے اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔ (بخاری و مسلم) اور ایک حدیث میں ہے "لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ" جو لوگوں پر رحم نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرتا۔ مذہب اسلام نے کسی شخص کی دل آزاری وایذاء رسانی سے سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے حتی کہ حیوانات وچوپایوں کو بھی بلاوجہ تکلیف دینے سے اجتناب کی تاکید کی ہے اور ان کے ساتھ بے رحمی کا مظاہرہ کرنے سے منع کیا ہے۔

قرآن کریم نے تھوڑی دیر کے ساتھی کے بھی حقوق بیان فرمائے "والصاحب بالجنب" (نساء آیت ۳۶) اس کے لفظی معنی ہیں ہم پہلو ساتھی یا تھوڑی دیر کا ساتھی جس میں رفیق سفر بھی داخل ہے جو جہاز، ریل، بس وغیرہ گاڑی میں آپ کے برابر اور پہلو میں بیٹھا ہو اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "شریعت اسلام نے جس طرح نزدیک دور کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق واجب فرمائے اسی طرح اس شخص کا بھی حق صحبت لازم کردیا جو تھوڑی دیر کے لئے کسی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو جس میں مسلم وغیر مسلم اور رشتہ دار وغیر رشتہ دار سب برابر ہیں اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول وفعل سے اس کو ایذاء نہ پہنچے کوئی گفتگو ایسی نہ کرے جس سے اس کی دل آزاری ہو کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے اس کو تکلیف ہو مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں یا پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہوجائے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ اگر قرآن کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافر کے ساتھ جھگڑے ختم ہوجائیں ہر شخص اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس گاڑی میں اس کا بھی اتنا ہی حق جتنا کہ میرا ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری کے اندر مختلف صحابہ وتابعین کے اقوال نقل کئے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت مجاہد، عکرمہ، قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ "صاحب بالجنب" سے رفیق سفر مراد ہے۔ حضرت جریج وابن زید رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص

مراد ہے جوتم سے کسی نفع کی امید پر تمہارے ساتھ شریک ہے لہٰذا یہ شاگرد اور ہم سبق ساتھی کو بھی شامل ہوگا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے بیوی مراد ہے جوشوہر کے پہلو میں رہتی ہے اور امام بخاری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ وہ رفیق سفر ہے۔ بعض حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ ''صاحب بالجنب'' میں ہر وہ شخص داخل ہے جوکسی کام اور کسی پیشہ میں آپ کا شریک صنعت ہے، مزدوری میں، دفتر کی ملازمت میں، سفر میں حضر میں اور کسی دعوت، جلسے، یا اجتماع عام کے مواقع میں جو شخص ہمارے قریب اور پہلو میں ہے وہ ہمارا ''صاحب بالجنب'' ہے۔ غرض قرآن کریم کے الفاظ کی وسعت ان تمام کو محیط ہے۔

قرآن کریم نے خاص طور پر ''صاحب بالجنب'' کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید بظاہر اس حکمت کے پیش نظر فرمائی ہے کہ انسان کی شرافت وخوش اخلاقی کا اصل مظاہرہ ایسے ہی موقعوں پر ہوتا ہے، اچھے اچھے بظاہر مہذب، بااخلاق، شائستہ ہوتے ہیں لیکن کبھی کسی انجانے اور اجنبی سے واسطہ اور سابقہ پڑا یا سفر وغیرہ کی نوبت پیش آئی تو وہ تہذیب وتمدن سے عاری اور خوش اخلاقی کے بجائے بداخلاقی کا مظاہرہ اور وہ بھی ایسی کہ انھوں نے اپنے ہم سفروں کے ساتھ پرلے درجے کی خودغرضی کا برتاؤ اور سنگدلی کرتے نظر آئے۔ اسی لئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ تم کسی شخص کی نیکی کی حتمی گواہی اس وقت تک نہ دو جب تک تمہارا اس کے ساتھ کوئی لین دین نہ ہوجائے جس میں تم نے اس کے اندر اسے کھرا پایا ہو یا اس کے ساتھ تم نے کوئی سفر کیا ہو جس کے اندر تم نے واقعی اس کو خوش اخلاق پایا ہو۔ انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کررہے ہیں یا برا؟ فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کررہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھ لو کہ برا کررہے ہو۔ (ابن ماجہ)

خوش اخلاقی جو صرف بدنامی کے خوف اور دوسروں کی طعن وتشنیع سے بچنے کے لئے کی جائے وہ خوش اخلاقی نہیں بلکہ ریا ہے، خوش اخلاقی دراصل ایسی صفت ہے جو صرف رضاء خداوندی کے پیش نظر کی جائے جس کے اندر شہرت ونیک نامی کو بالکل دخل نہ ہو اور جب یہ صفت کسی شخص کے اندر پیدا ہوجائے تو وہ شخص ہر جگہ اور ہر انسان کے ساتھ رضا خداوندی کے پیش نظر اپنی اس پاکیزہ فطرت کے تحت وہی رویہ وہی بتاؤ اور طرز عمل اختیار کرے گا جو اسے کرنا چاہئے

کیونکہ اس کے سامنے شہرت وناموری اور لوگوں کے دیکھنے کا ڈر نہیں بلکہ اس ذات کے دیکھنے کا خوف ہے جس کی خوشی اور غضب سے جنت وجہنم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اگر انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں بلاتفریق مذہب وملت اپنے ہر ہمسایہ و پڑوسی اپنے مصاحب وقریبی اپنے ہم مجلس، اور اپنے ہر طرح کے ہم سفر کے ساتھ، نرمی، خوش خلقی، اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرے اور ان کے راحت وآرام کی خاطر تھوڑی تکلیف ومشقت ہی برداشت کرلے تو ان کے دلوں پر اس کے اخلاق وکردار کا جو نقش مرتب ہوگا وہ تادیر قائم رہے گا۔ وہ ہمیشہ اس کا محسن رہے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا جو بینک بیلنس ہوگا وہ دنیا کے مال ودولت کے ذخیرے سے بہتر وپائیدار ہوگا اور آخرت کی دائمی وابدی زندگی میں اس کے لئے کارآمد وباعث نجات ہوگا، اور اس طرح ہمارا معاشرہ امن وامان کا گہوارہ اور زندگی کے اس چین وسکون کا باعث ہوگا، ہر شخص آج جس کا خواہاں اور مال ودولت کی فراوانی، سامان عیش وعشرت کی بہتات کے باوجود آج دنیا جس سے محروم ہے اور محرومیت کا سلسلہ مزید دراز ہوتا جارہا ہے۔ اللہ رب العزت تمام انسانوں کو چین وسکون کی لازوال دولت سے مالامال کرے بے چینیوں اور الجھنوں سے محفوظ رکھے اور اسلامی معاشرے کی خوش گوار فضاء کو قائم فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

میرے قابل احترام اساتذۂ کرام

(۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ

از: مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

تمہید:

بہت عرصے سے میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے محترم اساتذۂ کرام کے تعلق سے جو یادداشتیں مشاہدات وتجربات طالب علمی کے زمانے کے میرے ذہن میں محفوظ ہیں ان کو مرتب کردوں۔ کبھی بہت پہلے کچھ چیزیں لکھی بھی تھیں جو ''چند باتیں چند یادیں'' کے عنوان سے بعض رسالوں اوراخباروں میں مختصر مختصر مضامین کی شکل میں شائع بھی ہوئیں اور پسند کی گئیں۔

چند سال پہلے میں نے کچھ ایسی یادداشتیں مدینہ طیبہ کے تعلق سے لکھیں جن میں حضرت مولانا سید بدر عالم صاحبؒ کا ذکر تھا، وہ چھپیں اور پاکستان کے رسالوں نے خاص طور پر ان کو نقل کیا اور میرے پاس خطوط آئے کہ آپ ایسی یادداشتوں کو جمع کردیں یہ بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔

اب جب کہ دن ڈھل چکا ہے، شام ہوچکی ہے اور زندگی کا سورج ڈوبا ہی چاہتا ہے، دل چاہتا ہے کہ اپنے لائق صداحترام اساتذۂ کرام کے تعلق سے جو باتیں ذہن میں ہیں وہ تحریر میں آجائیں۔ یہ صرف احسان مندی کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ اساتذہ اور طلبہ کے تعلق سے ہمارے اس تہذیبی، دینی اور علمی ورثے کو بھی تازہ کرنا ہے کہ جو اخلاص اور جذبۂ ہمدردی اساتذہ اور طلبہ کے درمیان ہوتا تھا آج وہ ہماری دینی درسگاہوں میں بھی کمزور دکھائی دینے لگا ہے۔

ہماری دینی درسگاہوں کا امتیازی پہلو صرف تعلیم وتعلّم نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ تربیت اخلاق اہم ترین عنصر تھا جو طلبہ کی زندگی کو اخلاقی سانچوں میں ڈھالتا تھا اور وہ درسگاہوں سے نکلتے تھے تو علم کے ساتھ ساتھ اخلاق سے مزین ہوتے تھے۔

بات شروع کرنے سے پہلے اپنی اس کمزوری کا اظہار بھی کردوں کہ کبھی بہت لکھنے والا ہاتھ

عمر کے ساتھ ایسا کمزور ہوگیا ہے کہ چند سطروں سے زیادہ مسلسل لکھ نہیں پاتا اور مجبوراً اِملا کرانا پڑتا ہے۔ قلم اور دماغ کا جو ایک خاص رشتہ ہے آمد مضامین میں اس کا بڑا دخل ہے، شاید اسی لئے غالب نے کہا تھا۔

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اب خامہ بدستِ دیگر ہے اور خیالات خطاب کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ بہر حال یہ تو ایک کمزوری ہوئی جسکا اظہار گویا قارئین کے سامنے ایک معذرت بھی ہے۔

اب دوسری بات کہ قابل احترام اساتذہ میں سے سب سے پہلے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہ کا تذکرہ ہی کیوں کیا گیا ہے اور بہت سی باتوں کے علاوہ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ میری دینی زندگی کو دوبارہ پٹری پر لانے اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانے میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مومنانہ نگاہ کا بہت بڑا دخل ہے۔

اس کا واقعہ دلچسپ بھی ہے اور نصیحت آموز بھی جو آپ انشاء اللہ آئندہ سطروں بعد ملاحظہ فرمائیں گے۔

❁ ❁ ❁

بات ۱۹۵۶ء مطابق ۱۳۷۶ھ کی ہے۔ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں درسِ نظامی میں ایک مرحلہ آتا ہے جس کو ''موقوف علیہ'' کہا جاتا ہے موقوف علیہ کا مطلب یہ ہے کہ جس پر دورۂ حدیث کی تعلیم موقوف ہوتی ہے، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح پڑھنے کے بعد اب دورۂ حدیث میں داخلے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔

تو جناب یہ بندۂ ناچیز مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کہ اگلے سال فاضل کے آخری درجے دورۂ حدیث میں داخلہ ہونا تھا اَینٹھ گیا کہ میں آگے مولوی نہیں بنوں گا بلکہ کسی کالج میں جا کر پڑھوں گا۔ والد صاحب کے سامنے براہ راست کچھ کہنے کی ہمت تو کبھی نہیں ہوئی مگر والدہ کے ذریعے ہم نے اپنی بغاوت کا کھلا اعلان کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا، کچھ اور سوچنے کا مطلب گھر سے بھاگنا بھی ہوسکتا تھا۔ بہر حال یہ دھمکیوں کا سلسلہ چلتا رہا اور رمضان المبارک کی چھٹیاں ختم ہو کر شوال سر پر آ گیا۔ گیارہ تاریخ سے مدرسے کھل گئے، داخلے شروع ہو گئے، داخلوں کے زمانے میں دیوبند کی چہل پہل اور رونق الگ ہی منظر پیش کرتی ہے۔ ہم کالج کے خیالوں میں مگن طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے کہ ایک

دن باہر سے گھر میں آئے تو دیکھا سامنے دالان میں تخت پر بڑی بڑی کتابوں کا ایک چٹّہ رکھا ہوا ہے کھول کر دیکھا تو وہ نئی چرمی جلدوں میں بخاری شریف، مسلم وغیرہ صحاح ستّہ اور دورۂ حدیث کی پوری کتابیں وہ بھی بالکل نئی رکھی ہوئی ہیں۔

ہم نے ان کو دیکھ کر والدہ سے کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟

انھوں نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم تم اپنے ابّا سے پوچھ لینا۔

دوپہر کا کھانا سب ساتھ کھایا کرتے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے والد صاحب نے کہا کہ ''شاید تم ان کتابوں کو دیکھ کر ڈر رہے ہو، ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمھیں تو کالج میں پڑھنا ہے مولوی بننا نہیں ہے، مگر یہ کتابیں پورے سال یہاں رکھی رہیں گی اور ہم ان کو دیکھا کریں گے کہ اگر تم پڑھتے تو ان کو پڑھتے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے ہمیں ایک حیرت کے عالم میں چھوڑ دیا۔

آٹھ دس دن کے بعد غالباً بیس شوال سے جب سبق شروع ہونے تھے، دارالعلوم کے ٹائم ٹیبل کے حساب سے چوتھا گھنٹہ شروع ہونے والا تھا کہ والد صاحب نے مجھے اپنی درسگاہ میں بلایا۔

قارئین کو بتاتا چلوں کہ میرے والد مرحوم کا نام حضرت مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانی تھا اور وہ دارالعلوم دیوبند کے تجوید کے استاذ تھے، احاطۂ مولسری میں نودرے کے احاطے میں جنوبی طرف ان کی درسگاہ تھی، جہاں انھوں نے تقریباً ساٹھ سال قرأت وتجوید کا درس دیا۔

تو بات چل رہی تھی کہ چوتھے گھنٹے کے قریب والد صاحب نے مجھے اپنی درسگاہ میں بلایا اور فرمایا کہ ''ابھی تھوڑی دیر کے بعد مولانا حسین احمد صاحب مدنی بخاری شریف کا درس شروع کرائیں گے، تمھیں تو کالج میں پڑھنا ہے لیکن اگر تم مناسب سمجھو تو بغیر کتاب لیے ویسے ہی جاکر مولانا کے سبق میں شرکت کرلو تو اچھا ہے۔'' اس کے ساتھ انھوں نے چند جملے یہ بھی فرمائے کہ ''تمھاری نوعمری ہے، مولانا کا مرتبہ کیا ہے یہ تم جانتے نہیں ہو، بڑے بڑے علماء مولانا سے پڑھنے کی تمنا کرتے ہیں اور تمہارے تو گھر میں ہی نہر بہہ رہی ہے۔''

میں نے دل میں سوچا ابا جی میری ساری باتیں مان رہے ہیں چلو اتنی چھوٹی سی بات اگر میں ان کی مان لوں تو کیا حرج ہے۔

میں اٹھا، وہاں سے چل کر چند قدم پر ہی دارالحدیث تحتانی میں دورۂ حدیث کے طلباء جمع تھے، میرے ہاتھ میں کتاب بھی نہیں تھی، اتفاق سے جگہ ملی تو حضرت مدنیؒ بالکل عین سامنے۔

طریقہ یہ تھا کہ بخاری شریف کا درس دو پہر کو اور رات کو ہوتا تھا، رات کے درس میں حضرت مدنیؒ خطبہ اور عبارت خود پڑھتے تھے، دن کے درس میں حدیث کی عبارت کوئی طالب علم پڑھتا تھا۔ مگر پہلے دن، دن میں بھی خطبہ اور حدیث خود حضرت مدنیؒ پڑھا کرتے تھے۔ اُس وقت درس میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ حضرت مدنیؒ کی آواز بہت بلند تھی اور طلبہ کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی، اُس سال دورۂ حدیث میں دوسو ساٹھ طلبہ تھے۔

اب سنئے کہ ہمیں جگہ ملی حضرت مدنیؒ کے عین سامنے، تھوڑی دیر کے بعد حضرت مدنیؒ نے اپنی بلند، باوقار اور کھنک دار آواز میں خطبہ حدیث پڑھا، پھر حدیث کی تلاوت فرمائی۔ کیا کہیں، کیسے کہیں، اس کیفیت کے لئے الفاظ کہاں سے لائیں، بس ایسا معلوم ہورہا تھا کہ پوری فضا نور سے بھری ہوئی ہے، فرشتے اپنے پروں کا سایہ کیے ہوئے ہیں اور بلا مبالغہ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ حضرت مدنیؒ سیدھے میری آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس نگاہ نے میری دل کی دنیا کو زیروزبر کردیا، کچھ لمحے کے لئے تو ایسا محسوس ہوا کہ پورے ہال میں میرے اور حضرت مدنیؒ کے سوا کوئی اور نہیں ہے، پھر دل کا سارا غبار آنسوؤں کے راستے سے ڈھلتا چلا گیا جو چند لمحے پہلے تھا وہ اب نہیں تھا ''نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی'' سب کچھ بدل چکا تھا۔ میں گھر واپس آیا اور گھر والوں سے کہا کہ اب میں مولوی بننا چاہتا ہوں۔ ابا جی تو اس لمحے کے جیسے منتظر تھے خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے، دادے ابا کی مسجد، مسجد عزیز میں میرے لئے وہ کمرہ صاف کرایا گیا جس میں کبھی طالب علمی کے زمانے میں میرے تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ رہا کرتے تھے، ان کی طالب علمی کے زمانے کی کچھ کتابیں بھی مجھے ان کے کمرے سے ملیں۔

کمرے میں چائے بنانے کے لئے جو اسٹو وراثت میں ملا وہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا تھا، صاف کرکے جو پالش لگایا تو ایسا چمک گیا جیسے بالکل نیا ہو، وہ اسٹو یہاں مالیر کوٹلہ آنے تک میرے پاس رہا، پھر ایک دن کسی چور کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے میرے اوپر کے کمرے سے وہ اسٹو چرالیا جس کا مجھے بڑا افسوس رہا کہ وہ بھی ایک یادگار چیز تھی۔

بہرحال کمرہ تایا ابا کا، اسٹو حضرت دادا صاحب کا اور ہمارے کمرے کے ساتھی بنے رفیق درس مولانا شفیق عالم پورنوی، قاضی مجاہد الاسلام صاحب ہم سے ایک سال پہلے دورۂ حدیث سے

فارغ ہوچکے تھے، ان سے درس کی کچھ کا پیاں ہتھیائیں اور شب وروز کا مشغلہ بس مطالعہ مطالعہ، سبق سبق، پڑھنا ہی پڑھنا تھا۔ صبح فجر کے بعد سبق شروع ہوتے تھے، دوپہر، عصر بعد اور مغرب بعد کے علاوہ رات کے بارہ بجے تک سبق چلتے رہتے تھے۔ مگر مطالعہ اور سبق کی یہ مشغولیات ذہن پر ذرا بھی بار نہیں ہوتی تھیں اور عجیب سی سرمستی اور خوشی کی کیفیت رہتی تھی۔ نہ دن کی خبر نہ رات کی، نہ تکلف نہ الجھن۔ ساتھیوں کے ساتھ خوشگوار صحبتیں، علمی بحثیں۔ طالب علمانہ زندگی کا وہ لطف جو اُس سال آیا پھر کبھی میسر نہ آیا۔

”دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن“

ہمارے دیوبند کے ساتھیوں میں سب سے زیادہ متقشف قسم کے مولانا خورشید عالم صاحب تھے، مگر تھوڑے دنوں میں ہم نے ان کو بھی اپنے ڈھرے پر لگالیا اور وہ بھی محفلوں میں اسی طرح شریک ہونے لگے۔ مولانا حسیب صدیقی ہمارے شروع سے ساتھی تھے۔ بھوپال کے مولانا عبدالرزاق صاحب اور کتنے ہی لوگ تھے۔

۞ آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس پر توجہ فرمائیں کہ والد صاحب نے کس خوبصورتی کے ساتھ ایک ماہر نفسیات کی طرح میرے ذہن کو موڑ دیا اگر وہ سختی سے کام لیتے، ڈانٹ ڈپٹ کرتے تو شاید میری ضد بڑھتی چلی جاتی لیکن انھوں نے ہلکے ہلکے میرے جذبات کو ایک رُخ دیدیا اور بڑی عمدگی سے بات منوالی جو ظاہر ہے میرے ہی فائدے کی تھی۔ دوسری طرف استاذ گرامی کی نگاہِ کامل کا اندازہ کیجئے، اب آپ اس کو روحانیت کی زبان میں جو بھی نام دینا چاہیں دے لیں لیکن اس کی تاثیر سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے جس کو میں نے خود محسوس کیا۔ ہمارے مدارس میں یہی نسبتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ ادارے اندھیروں میں چراغ جلاتے رہے۔

۞ درس شروع ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اور حضرت مدنیؒ سے میری عقیدت کا تعلق ہر دن زیادہ ہوتا چلا جارہا تھا کہ والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمھیں حضرت مدنی کی دعوت کرنی چاہئے۔ میں نے کہا کیسے کہوں میری تو ہمت ہی نہیں پڑتی۔

ابا جی نے کہا نہیں تم ان سے عرض کرو انشاء اللہ وہ قبول کرلیں گے۔

چنانچہ سبق سے فارغ ہونے کے بعد جب دوپہر کو حضرت درسگاہ سے باہر تشریف لائے تو میں ہمت کرکے آگے بڑھا اور کہا مجھے کچھ عرض کرنا ہے!

حضرت سن کر کھڑے ہوگئے اور کہا فرمائیے!

میں نے کہا آپ کیدعوت کرنے کو دل چاہتا ہے!

اس پر جو حضرت نے جملے ارشاد فرمائے وہ میرے لئے انتہائی حیران کن تھے، میرا خیال تو یہ تھا کہ شاید حضرت مجھے پہچانتے بھی نہ ہوں گے اور مجھے اپنا تعارف کرانا ہوگا، مگر یہ سب اندازے غلط تھے۔ حضرت مجھے جانتے اور پہچانتے تھے اور آپ نے نہایت شفقت اور محبت کے لہجے میں فرمایا کہ:

''میں آپ کے گھرانے کا خادم ہوں، جب کہیں حاضر ہوجاؤں، کیا آج ہی چلوں؟''

میں نے عرض کیا کہ کل شام کو مناسب ہے۔

فرمایا ''بہتر ہے میں حاضر ہوجاؤں گا''۔

اگلے دن شام کو میں حضرت کو لینے کے لئے جانے بھی نہیں پایا تھا کہ بعد نمازِ مغرب حضرت تانگے میں بیٹھ کر خود ہی تشریف لے آئے۔

اور شفقت کی انتہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ خود تشریف لائے بلکہ اپنے ساتھ اپنے داماد بھائی رشید الدین حمیدی اور ارشد میاں وغیرہ سب کو لے کر آئے۔

دیوبند میں بھائی ناصر مرحوم کا تانگا حضرت کے لئے مخصوص تھا، اسٹیشن وغیرہ جہاں بھی جاتے تھے اسی تانگے سے جاتے تھے۔

حضرت کی تشریف آوری بادِ بہاری کی آمد سے کم نہ تھی، سارے گھر میں عجیب مسرت کا احساس تھا، پھر حضرت نے فرداً فرداً ایک ایک بچے کو بلایا، شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں فرماتے رہے۔

صاف نظر آرہا تھا کہ یہ آنا عام آنا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مخصوص انداز ہے۔ بہت دیر حضرت بیٹھے رہے، مسرت کا اظہار فرماتے رہے اور پرانے تعلق کو یاد کرتے رہے۔ غالباً حضرت میرے دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بھی تھے۔

لیکن سچائی یہ ہے کہ اب سے پہلے دادا مرحوم کے بھائی حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ ان کے سیاسی اختلافات کی وجہ سے کچھ بُعد محسوس ہوتا تھا مگر اب وہ دوری کا احساس انتہائی قربت میں بدل گیا تھا اور وہ پرانی باتیں ذہن سے نکل گئی تھیں۔

اب تو یہ بڑے میاں ہمیں اتنے اچھے لگتے تھے کہ دل چاہتا تھا کہ دیکھتے ہی رہیں۔ اللہ نے

وہ نورانیت اور چہرے پر وہ وقار عطا کیا تھا کہ جو ایک دفعہ دیکھ لیتا تھا اس کا دل حضرت کی طرف کھنچنے لگتا تھا۔

جب واپس ہو کر تانگے میں بیٹھنے لگے تو حضرت کی عادت تھی کہ تانگے میں پیچھے کی طرف بیٹھتے تھے۔ والد صاحب نے مجھے ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔ اگلے حصے میں سب بیٹھے ہوئے تھے اور تانگے کے پچھلے حصے میں حضرت کے برابر میں بیٹھتے ہوئے مجھے جھجھک ہوئی تو حضرت نے نہایت محبت سے ڈانٹتے ہوئے فرمایا ''میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتا، کیا میں تجھے کھا جاؤں گا۔'' اور میں جلدی سے آپ کے پاس بیٹھ گیا۔

آپ کے اس مشفقانہ انداز کا آج تک دل پر گہرا اثر ہے۔

❁ درس کے دوران کئی واقعات ایسے پیش آئے جس سے حضرت کی عظمت دل میں اور زیادہ ہوگئی۔

ایک دن کا واقعہ ہے، دوپہر کو بخاری شریف کا درس ہو رہا تھا کہ کسی نے آکر حضرت سے کہا کہ سینٹر سے منسٹر تیاگی صاحب حضرت سے ملنے کے لئے آئے ہیں اور گھر پر مہمان خانے میں انتظار کر رہے ہیں۔

ہم نے سمجھا کہ چونکہ منسٹر صاحب آئے ہیں اس لئے آج حضرت سبق جلدی ختم کردیں گے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہوا، حضرت نے مقررہ وقت سے بھی پندرہ بیس منٹ زیادہ پڑھایا۔ سبق ختم ہونے پر ہم بھی حضرت کے ساتھ ساتھ چلے کہ منسٹر صاحب کو دیکھیں گے، منسٹر صاحب مہمان خانے میں منتظر تھے، چند رسمی باتوں کے بعد حضرت نے آنے کی وجہ دریافت کی، یاد نہیں انھوں نے کیا وجہ آنے کی بتائی، اتنا یاد ہے کہ حضرت ان پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ آپ لوگ حکومت میں جاکر مسلمانوں کو بھول جاتے ہیں۔

حضرت نے مولانا اسعد میاں کو چائے کے لیے اشارہ کیا تو معلوم ہوا کہ منسٹر صاحب کے لئے قاری اصغر علی صاحب کی طرف سے الگ چائے کا انتظام کیا گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ الگ نہیں، یہیں سب کے ساتھ پئیں گے۔ اسی مجمع میں دیہاتی اور بہت سارے لوگ گھسے ہوئے تھے کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں تھا، سب کے ساتھ یکساں سلوک اور اس بے نیازی کو دیکھ کر حضرت کی وقعت دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔

اور اب مجھے اپنے بچپن کا یہ منظر تو ابھی تک یاد ہے کہ جب شاہ سعود ہندوستان آئے تھے تو

دہلی کے تال کٹورا گارڈن میں ان کے اعزاز میں جمعیۃ العلماء ہند کی طرف سے چائے پارٹی دی گئی تھی۔ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے تھے، جب پارٹی شروع ہوئی تو ایک کرسی پر شاہ سعود جلوہ افروز تھے برابر میں حضرت مدنیؒ اوراس کے ساتھ پنڈت جواہرلال نہرو بیٹھے تھے۔ جواہرلال نہرو بار بار جھک جھک کر حضرت مدنیؒ سے باتیں کرتے تھے مگر حضرت نہایت شانِ بے نیازی کے ساتھ سیدھے بیٹھے ہوئے جواب دیتے رہے، ایک بار بھی جھک کر جواہرلال نہرو کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

اس عالمانہ وقار اور شانِ بے نیازی نے ایسا متاثر کیا کہ اب کوئی جلدی سے نگاہوں میں سماتا نہیں ہے۔

ان کے جلووں کا تصور آ گیا تھا ایک بار
اب میری نظروں میں کوئی دید کے قابل نہ تھا

حضرت مدنیؒ نے حکومت ہند کے دیے ہوئے اعزاز ''بھارت بھوشن'' کو بھی بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

۞ حضرت کا درس خشک نہیں ہوتا تھا، بعض اوقات بڑی پُرلطف باتیں بھی ہوجاتی تھیں۔ اسی سال حضرت کے یہاں جب کہ غالباً عمر بھی اسّی سے اوپر ہی رہی ہوگی اللہ نے لڑکا عطا کیا اسجد میاں سلّمہٗ پیدا ہوئے۔ ہم نے پرچہ لکھ کر بھیجا کہ اللہ نے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کی طرح اسّی سال کی عمر میں بیٹا دیا ہے مٹھائی کھلائیے۔ کئی روز تک اس پر تقریر ہوتی رہی کہ میں غریب آدمی ہوں اہل وعیال کے اخراجات زیادہ ہیں، آپ لوگ میرے اوپر اتنا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں، مٹھائی کے پیسے کہاں سے لاؤں۔

غرض اسی طرح کی پُرلطف باتیں کئی روز تک ہوتی رہیں اور پھر شاندار قسم کی مٹھائی غالباً دس دس بارہ بارہ بالوشاہیاں ہر طالب علم کو حضرت کی طرف سے عنایت ہوئیں۔

شگفتہ مزاجی اور ہلکا پھلکا مزاح ہمارے بزرگوں کے مزاج کا حصہ رہا ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے پرچہ لکھ کر بھیجا کہ آپ اپنے سامنے جو جگہ چھوڑتے ہیں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں جنات آکر بیٹھتے ہیں اور یہ جگہ ان کے لئے چھوڑی جاتی ہے، جب انسان اشرف المخلوقات ہے تو جنات

کو ہم پر مقدم کیوں رکھا جاتا ہے۔ اس پر بھی حضرت نے جن واِنس کے تعلق سے ایک بڑا شگفتہ خطاب فرمایا جس میں دلچسپی بھی تھی اور معلومات بھی۔

❁ درس کے دوران ایک واقعے نے تو میرے اوپر حیرت کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ اصل میں معاملہ یہ تھا کہ حضرت مدنیؒ کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ان کے جوتے اٹھائے اور سامنے رکھ دے، اگر کوئی طالب علم ایسا کرتا تھا تو حضرت کافی ناراض ہوتے تھے۔

اب یہ ہماری شوخی کہئے کہ ہم نے حضرت کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایک روز فرطِ عقیدت میں حضرت کے جوتے اٹھائے اور حضرت کے سامنے رکھ دیے، خلافِ معمول حضرت نے ہمیں کچھ نہیں کہا، خاموشی کے ساتھ جوتے پہن لیے اور تشریف لے گئے۔ اس بات کو کئی دن گذر گئے، ایک دن جیسے ہی سبق ختم ہوا حضرت بجلی کی تیزی کے ساتھ اٹھے اور معلوم نہیں کیسے ان کو ہمارے جوتے رکھنے کی جگہ کا پتہ لگ گیا، ہمارے جوتے اٹھائے اور ہمارے سامنے رکھ دیے اور فرمایا ''آپ نے ہمارے جوتے اٹھائے تھے ہم آپ کے جوتے اٹھائیں گے۔'' اب آئندہ کسی کی ہمت تھی کہ حضرت کے جوتے اٹھا سکے۔ اس طرح انھوں نے گویا عملاً یہ سبق سکھا دیا کہ تواضع کیا ہے، عقیدت کیا ہے اور ان رسمی چیزوں سے دلی جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

❁ ایک روز ہمیں خیال آیا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی چیز بنا کر حضرت کو کھلائیں۔ ہم نے بڑی محنت سے زردہ بنایا، بہت اچھا بنا، مغرب کی نماز کے بعد حضرت کے یہاں کھانا ہوتا تھا، بڑی سی پلیٹ میں لے کر حضرت کے یہاں پہنچے، کھانا لگانے کی تیاری ہو رہی تھی، دسترخوان بچھ رہا تھا اور حضرت بھی تشریف فرما تھے۔ وہاں جا کر ہمت نہ پڑی اور ستون کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا، حضرت نے کہیں دیکھ لیا، پوچھا کون ہے، میں سامنے آیا تو فرمایا کہ کیوں آئے ہو، پلیٹ ہاتھ میں تھی، کہا یہ لے کر آیا ہوں، اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ حضرت نے بڑی محبت سے قبول فرمایا، تھوڑا سا کھا کر فرمایا کہ اتنی اچھی چیز کو چھپا کیوں رکھا تھا۔

❁ غرض دورۂ حدیث کا یہ سال عجیب سی سرخوشی میں دیکھتے دیکھتے گذر گیا۔

جلوۂ گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

سالانہ امتحان ہوا تو حضرت کی برکت کہئے یا والد صاحب کی دعائیں اور تمنائیں کہ ایسے ایسے قابل اور لائق وفائق طلبہ کے درمیان جو دوسرے مدرسوں سے دورۂ حدیث پڑھ کر آئے تھے اور حضرت مدنیؒ کی وجہ سے دوبارہ دورۂ حدیث میں داخلہ لیا تھا، ہم جیسے ناکارہ اور پھسڈی قسم کے

طالب علم بھی سیکنڈ ڈویژن کے نمبرات لے کر پاس ہوگئے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ والد صاحب کو ہمارے سند لینے کی بڑی جلدی لگی ہوئی تھی اور ہم حسب معمول ٹال مٹول کررہے تھے کہ جلدی کیا ہے لے لیں گے۔ جب والد صاحب نے ہماری سہل انگاری کو محسوس کیا تو خود ہی درخواست دے کر سند حاصل کرلی اور اس پر حضرت مدنیؒ کے دستخط کرالیے، بلکہ ایک خصوصی سند بھی حضرت نے عنایت فرمائی۔ والد صاحب کی عجلت پر حیرت اس وقت ختم ہوئی جب آئندہ سال چند مہینہ پڑھانے کے بعد ہی ۱۳۷۷ھ=۱۹۵۷ء میں حضرت کا وصال ہوگیا اور ہمارے بہت سے ساتھیوں کی سندیں حضرت کے دستخط کی برکتوں سے محروم رہ گئیں۔ اس طرح حضرت سے مکمل بخاری شریف پڑھنے والوں کی یہ ہماری جماعت آخری جماعت تھی۔

❁ یہ تو ہوئے وہ مشاہدات اور تجربات جو طالب علمی کے زمانے میں میرے سامنے آئے، مختصر طور پر شیخ العرب والعجم کی زندگی کے حالات بھی آپ کے سامنے آجائیں تو میں اس کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تاریخ ولادت ۱۹؍شوال المکرّم ۱۲۹۶ھ ہے۔ آپ موضع الٰہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام نامی حضرت مولانا سید حبیب اللہ صاحب تھا۔ سید حبیب اللہ صاحب حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ خاص تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا تاریخی نام چراغ محمد تھا۔ آپ حسینی سید ہیں۔ مڈل تک ابتدائی تعلیم اپنے والد کے پاس حاصل کیں، قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کی تعلیم والد کے علاوہ والدہ سے بھی حاصل کی۔

جس زمانے میں آپ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مالٹا میں قید تھے وہاں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔

۱۳۰۹ھ میں جس وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور اپنے بڑے بھائی مولانا صدیق احمد اور اپنے شفیق استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانی دیوبندیؒ کی نگرانی میں درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کی۔

درسِ نظامی کی کچھ ابتدائی کتابیں شیخ الہندؒ نے آپ کو خود پڑھائیں۔ درسِ نظامی کی ۶۷ کتابیں جو سترّہ فنون پر مشتمل تھیں آپ نے ساڑھے چھ سال میں مکمل کیں اور ۱۳۱۴ھ میں

دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوگئے۔

درسی کتابوں کے علاوہ ابھی آپ طب، ادب اور ہیئت کی کچھ کتابیں پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ کے والد سید حبیب اللہ صاحب نے مدینہ منورہ کی ہجرت کا ارادہ کرلیا اور آپ بھی اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ مدینہ طیبہ چلے گئے اور باقی کتابیں مدینہ منورہ کے مشہور ادیب حضرت شیخ آفندی عبدالجلیل بُرادہ سے پڑھیں۔

آپ کے خصوصی استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی تھی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے ایک دو ہی طالب علم ہوں۔

۱۳۱۶ھ سے ۱۳۳۱ھ تک آپ کا زیادہ تر وقت مدینہ طیبہ میں بسر ہوا اور اس دوران آپ حرمِ نبوی ﷺ میں درس دیتے رہے۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۷ء تک دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے منصب پر فائز رہے اس کے علاوہ امروہہ، کلکتہ کے مدرسہ عالیہ اور سہلٹ کے جامعہ اسلامیہ میں بھی آپ نے درس دیا۔

❁ ۱۳۱۶ھ میں آپ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا اور اپنے دستِ مبارک سے دستارِ خلافت آپ کے سر پر باندھی۔

مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی بابرکت مجلس میں بھی روحانی تربیت حاصل کرتے رہے۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری آپ کے متعلق یہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مدنیؒ اس زمانے میں اولیاء اللہ کے امام ہیں۔

❁ درس وتدریس کے علاوہ طریقت وتصوف، ملی اور سیاسی خدمات کے ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی آپ کی نمایاں خدمات ہیں۔ آپ کی چند مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱- ''نقشِ حیات'' جو دو جلدوں میں ہے۔
۲- ''مکتوبات شیخ الاسلامؒ'' جس کی چار جلدیں ہیں۔
۳- بدعت کے خلاف آپ کی مشہور کتاب ہے ''الشہاب الثاقب''۔
۴- تعلیمی ہند

۵- اسیر مالٹا

۶- متحدہ قومیت اور اسلام

۷- ایمان وعمل

۸- مودودی دستور وعقائد کی حقیقت

۹- سلاسل طیبہ

۱۰- کشفِ حقیقت

۱۱- خطباتِ صدارت

❁ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بعد دارالعلوم دیوبند کی علمی اور عملی فضا میں حضرت مدنیؒ کا نام سب سے نمایاں رہا۔ آپ نے بڑی ہمت، استقلال اور جرأت کے ساتھ دین کی اور ملک وملت کی خدمات انجام دی۔ زندگی بھر تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وتبلیغ اور متعلقین کی تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ بڑے مہمان نواز، نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔

یہ بات مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے حضرت مدنیؒ اکثر مقروض رہتے تھے۔ دیوبند کے ایک تاجر مولانا سید احمد مالک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے حضرت قاری اصغر علی صاحب کے ذریعے قرض لیا کرتے تھے اور پھر آنے پر ادا کردیا کرتے تھے اگر وہ چاہتے تو دولت کے ڈھیر لگا سکتے تھے۔ مہمانوں کی خدمت خود کیا کرتے تھے۔ دیکھا گیا کہ رات کو چپکے چپکے مہمانوں کے پیر بھی دبا دیتے تھے۔ بہت سے لوگ اپنے کام کے سلسلے میں دیوبند آتے تھے اور حضرت کے مہمان بن جاتے تھے۔ اگر کوئی کہتا تھا کہ حضرت یہ اپنے کام سے آئے ہیں اور آپ کے یہاں مہمان بن کر پڑے ہوئے ہیں تو حضرت کو بہت برا لگتا تھا اور فرماتے تھے کہ تمہیں میرے مہمانوں سے کیا تکلیف ہے؟۔

مہمانوں میں اکثر گاؤں کے لوگ ہوتے تھے، میلے کچیلے کپڑے، گندے جوتے، کپڑوں سے بدبو آیا کرتی تھی۔ مگر حضرت مدنیؒ کبھی گھِن نہیں کرتے تھے اور خوشی خوشی ان کو پاس بٹھایا کرتے تھے۔

اکثر اپنے دستخط کے ساتھ ''ننگ اسلاف'' لکھنے کا معمول تھا۔ ایک مرتبہ والد صاحب نے کوئی تحریر لکھوائی تو پہلی بار خلافِ معمول دستخط کے ساتھ ''خادمِ علوم دینیہ'' تحریر فرمایا۔

مزاج کی شگفتگی کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے، اتباعِ سنت کے معاملے میں جہاں مزاج میں

کافی سختی تھی، عام ملاقاتوں میں اتنے ہی خوش مزاج نظر آتے تھے۔ میں نے کئی دفعہ اہتمام میں دیکھا کہ حضرت مدنیؒ تشریف لائے اور حضرت مہتمم صاحب مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے خوب مذاق فرمارہے ہیں۔

غرض علم وعمل، اخلاق وکردار، وضع داری اور خدمتِ خلق میں یہ ایک بے مثال شخصیت تھی جس کو کھوکر ہم نے بہت کچھ کھودیا ہے۔

حضرت مدنیؒ نے ۲۸/محرم الحرام ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵/اگست ۱۹۵۷ء کو بخاری شریف جلد اوّل کا آخری سبق پڑھایا اور ۱۳/جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵/دسمبر ۱۹۵۷ء کو علم وعمل، زہد وتقویٰ اور رُشد وہدایت کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا۔

مجھے اب تک وہ منظر یاد ہے کہ تحتانی دارالحدیث میں حضرت کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ لوگ لائن بنا کر چلے آرہے تھے اور اس نورانی صورت کا دیدار کرتے تھے جس نے زندگی بھر احیاء سنت نبویؐ میں اپنی عمر کھپادی۔ آنے والوں کا تانتا ٹوٹتا نہیں تھا، میں ایک طرف سرہانے کھڑا رہا، چہرے پر وہی وقار، وہی نورانیت اور وہی کشش جس نے میری زندگی کا دھارا بدل دیا تھا۔ جانا سب کو ہے مگر کچھ لوگ جاتے ہیں تو ہزاروں کو یتیم کرجاتے ہیں۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ آج میرے سر سے میرے روحانی باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ قبرستان قاسمی میں حضرت شیخ الہندؒ کے برابر میں دفن کیا گیا۔ زندگی میں بھی ہمیشہ استاذ محترم کے ساتھ رہے اور انتقال کے بعد بھی ان کی معیت حاصل ہوئی۔ رحمة الله عليه ورحمةً واسعة .

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

❁ ❁ ❁

فخر دیوبند حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ
حیات و خدمات

از: محمد اللہ خلیلی قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

گذشتہ ۵؍مئی ۲۰۰۹ء کو پاکستان میں برصغیر کے مشہور و متبحر عالم ربانی حضرت مولانا سرفراز خان صفدر (رحمۃ اللہ علیہ) کا سانحۂ انتقال پیش آیا۔ ملکی سرحدوں اور ہندوستان و پاکستان کے درمیان بے اعتمادی کے تعلقات کی وجہ سے کتنے ایسے آفتاب و ماہتاب ہیں جو سرحد کے اس پار چمک دمک رہے ہیں لیکن ہم اہل ہند کو ان کی عظمت اور اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ تاہم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر (رحمۃ اللہ علیہ) کا معاملہ پھر بھی مختلف ہے، آپ کی عظیم الشان جامع علمی شخصیت اور بلند پایہ علمی خدمات کا شہرہ ہندوستان کے دینی و علمی مراکز تک محیط ہے اور علوم اسلامیہ کا ہر طالب علم آپ کی محققانہ اور بابصیرت تصنیفات کے حوالے سے آپ کو خوب جانتا ہے۔

آپ امام اہل سنت کے لقب سے جانے جاتے تھے اور آپ کی عظیم شخصیت کو بجا طور پر فخر دیوبند اور ترجمان اہل حق کے طور پر جانا جاتا تھا۔ قرآن و حدیث، فقہ و تصوف اور جملہ علوم اسلامیہ میں آپ کو تبحر حاصل تھا۔ عقائد اہل سنت کی تشریح اور اہل حق کے مضبوط دفاع میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کا شمار ان چند گنے چنے کثیر التصانیف علمائے دیوبند میں ہوتا ہے جس فہرست میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کا نام آتا ہے۔ تقریباً ایک صدی پر محیط زندگی میں آپ نے متعدد میدانوں میں جو علمی، دینی، دفاعی اور اصلاحی خدمات انجام دی ہیں وہ بلاشبہ آپ کو زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی ہیں۔

ولادت اور تعلیم

آپ متحدہ ہندوستان کے مانسہرہ (صوبہ سرحد) کے ایک گاؤں ڈھکی چیڑاں داخلی کڑمنگ

میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی محمد سرفراز خان ابن نور محمد خان ابن گل احمد خان تھا۔ بچپن میں ہی والدہ فوت ہوگئیں۔ والد صاحب گوامی تھے، لیکن انھوں نے طلب علم کے لیے گھر سے دور بھیجا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مانسہرہ ہی میں مولانا غلام غوث ہزاروی سے حاصل کی۔ اسی دوران ۱۹۳۱ء میں والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنے برادر خورد کے ساتھ یتیمی اور بے کسی کی حالت میں برسوں یہاں وہاں بھٹکتے رہے۔ آخر کار کچھ خیر خواہوں کی رہنمائی سے سیالکوٹ و ملتان کا رخ کیا اور وہاں علمی تشنگی بجھائی۔ وڈالہ سندھواں ضلع سیالکوٹ میں مولانا محمد اسحاق رحمانی (شاگرد مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ) سے ابتدائی عربی کتب پڑھیں۔ ۱۹۳۷ء میں جہانیاں منڈی ضلع ملتان میں مولانا غلام محمد لدھیانوی (شاگرد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ) کے زیر سایہ علمی منازل طے کیے۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے آپ نے جامعہ انوار العلوم گجرانوالہ میں داخلہ لیا جس کے مہتمم مولانا عبدالعزیز صاحبؒ فاضل دیوبند اور صدر مدرس علامہ عبدالقدیر خان کیملپوری (شاگرد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ) تھے۔

آپ نے ۱۹۴۱ء میں اپنے چھوٹے بھائی مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور دورۂ حدیث میں داخل ہوئے۔ دیوبند میں آپ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بخاری و ترمذی پڑھی، جب کہ امام المنطق والفلسفہ علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے مسلم شریف اور شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ سے ابوداؤد شریف کی تکمیل کی۔ اس سال دورۂ حدیث میں ۳۳۳ طلبہ داخل تھے، جبکہ پورے دارالعلوم میں طلبہ کی تعداد ۱۹۹۵ تھی۔ اسی سال حضرت مدنیؒ کو مرادآباد میں ایک تقریر کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس موقع پر طلبۂ دارالعلوم نے حکومت کے خلاف زبردست احتجاج کیا، حضرت مولانا سرفراز صاحب صفدر اس تحریک میں طلبہ کے نمائندے تھے اور انھوں نے بڑے دانشمندانہ طریقے سے اکابرین دارالعلوم کے ساتھ مل کر اس ہنگامہ سے دارالعلوم کو بچایا ورنہ یہ خدشہ پیدا ہو چکا تھا کہ برطانوی حکومت اس بہانے سے دارالعلوم کو بند کردیتی۔

تدریس و دینی سرگرمیاں

تکمیل تعلیم کے بعد آپ نے مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد شیرانوالہ باغ (گجرانوالہ، پنجاب) میں تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ گکھڑ تشریف لائے جو اس زمانے میں شرک و بدعت کا

گڑھ تھا۔ یہاں آپ نے جامع مسجد میں خطابت اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور نہایت صبر آزما حالات میں کام کیا، لوگوں کو توحید وسنت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ گکھڑ میں ہی آپ نے گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ۱۹۴۳ء میں درس قرآن شروع کیا جس کا سلسلہ نصف صدی سے زیادہ مدت تک قائم و دائم رہا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ نے اپنے بھائی کے قائم کردہ جامعہ نصرۃ العلوم گجرانوالہ میں مدرس ہوئے جہاں آپ نے شیخ الحدیث کے عہدہ تک ترقی کی اور ۲۰۰۱ء تک بخاری شریف پڑھاتے رہے۔ ۲۰۰۱ء میں مرض کی شدت کی وجہ سے بخاری شریف پڑھانا چھوڑ دیا۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے خطابت کے سلسلے میں مشہور تھے۔ آپ کی گرمیٔ گفتار اور تقریری صلاحیت کو دیکھ کر طالب علمی ہی کے زمانے میں دیوبند کے مشہور مجاہد آزادی شاعر علامہ انور صابری نے آپ کو 'صوبہ سرحد کا ابوالکلام آزاد' کے لقب سے نوازا۔ چناں چہ آپ نے متحدہ ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحریک آزادی میں جمعیۃ علما ہند کے پلیٹ فارم سے شریک ہوتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں جب تحریک ختم نبوت شروع ہوئی اس میں بھرپور حصہ لیا۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور پہلے گجرانوالہ جیل اور پھر نیوسینٹرل جیل ملتان کو سنت یوسفی سے زندہ رکھا۔ نو ماہ جیل میں رہے۔ زنداں کی تنہائی و خلوت کی زندگی سے آپ کی تحریری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کی مختصر خودنوشت سوانح کے مطابق آپ نے اپنی کتاب 'ایک اسلام' کا مسودہ نیوسینٹرل جیل ملتان میں ہی تیار کیا۔ جیل میں بھی آپ کے علمی و دینی ذوق کی حد یہ تھی کہ تدریس وتصنیف کا سلسلہ ممکنہ حد تک جاری رکھتے۔

پاکستان میں اٹھنے والی دیگر تحریکات جیسے تحریک نفاذ شریعت اور تحریک نظام مصطفیٰ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے جب ایف ایس ایف کے کمانڈر نے وارننگ دی کہ اگر انھوں نے ریڈ لائن عبور کی تو انہیں گولی ماردی جائے گی۔ آپ نے تمام لوگوں کو روک کر کہا کہ آپ لوگ گواہ رہو، میں نے ۶۳ سال کی سنت عمر گزار لی ہے، میں شہادت کی تمنا رکھتا ہوں۔ چناں چہ آپ نے سب سے پہلے اس ریڈ لائن کو پار کرکے اس چیلنج کو قبول کیا۔

طریقت میں آپ کے شیخ حضرت مولانا حسین علی (واں بھچراں ضلع میانوالی) تھے جو نقشبندی مجددی شیخ خواجہ محمد عثمان درمانی کے خلیفہ اور امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے گل سرسبد، امام الموحدین حضرت مولانا

حسین احمد صاحب شیخ القرآن کے طور پر جانے جاتے تھے۔ آپ انھیں کے تلمیذ و مجاز، ان کی فکرو سوچ کے امین اور سلوک واحسان اور تفسیر و بیان میں ان کے علمی جانشین تھے۔

جامع علمی شخصیت

حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ ایک بے مثال علمی شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف آپ نے مدارس میں نصف صدی سے زائد مدت تک مسند درس سجا رکھی تھی جہاں سے چالیس ہزار سے زائد طالبین علوم نبوت نے آپ سے استفادہ کیا جو اس وقت پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی جگہوں پر انتہائی اہم اور قائدانہ کردار ادا کررہے ہیں۔ خصوصاً فن حدیث پر آپ کو بے انتہا عبور حاصل تھا، چناں چہ برصغیر کے ممتاز ترین محدثین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ دوسری طرف آپ شیخ طریقت تھے جہاں لوگ آپ سے استرشاد کا تعلق قائم کیے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد نقشبندی مجددی سے جو دولت قرآن آپ کو ملی تھی اسے بھی آپ نے گکھڑ میں نصف صدی سے زائد مدت تک پابندی کے ساتھ عوام وخواص کو تقسیم کیا۔ درس وتدریس اور تفسیر قرآن و خطابت جمعہ کی بے انتہا مشغولیت کے باوجود آپ نے تحریری میدان میں بھی قلم کی جولانی دکھائی اور مختلف موضوعات پر تقریباً ساٹھ کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جو اپنی علمی وقعت، تحقیقی بلندی اور اسلوب وزبان کی متانت کے لحاظ سے قابل صدرشک ہیں۔ آپ بہترین خطیب بھی تھے، پوری عمر جامع مسجد گکھڑ کے محراب ومنبر کو آپ نے اپنے علمی واصلاحی خطبوں سے رونق بخشی۔ مگر بایں ہمہ تواضع کا یہ عالم تھا کہ تحقیقی تحریروں اور علمی رفعتوں کے سبب علمی حلقوں میں جب آپ کو بجا طور پر امام اہل سنت کے لقب سے پکارا جاتا تو آپ کا ردعمل یہ ہوتا: ''جی ہاں میں اہل سنت والجماعۃ کی جامع مسجد کا امام ہوں''۔

دفاع حق اور فرق باطلہ کا تعاقب

دیوبند ہی میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے آپ کو 'صفدر' کا لقب عطا فرمایا تھا، جو بعد میں حرف بحرف آپ پر صحیح ثابت ہوا۔ اہل حق کے دفاع اور فرق باطلہ کے تعاقب کا سلسلہ گکھڑ کے اہل بدعت سے شروع ہوا۔ آپ نے بعد میں فتنۂ غیر مقلدیت، فتنۂ انکار حدیث، فتنۂ قادیانیت کو زبردست علمی دلائل سے رد کیا اور حق کی اشاعت وترویج کا حق ادا کردیا۔ آپ

نے جس فتنہ اور فتنہ پرور کا تعاقب کیا، اس کو گھر تک پہنچا کر دم لیا۔ مگر بایں ہمہ آپ نے ہمیشہ متانت وسنجیدگی اور قوت استدلال سے بات کی، کٹر سے کٹر مخالف بھی آپ کی حذاقت وصداقت اوراعتدال کا قائل اور آپ کے زوراستدلال کا معترف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصانیف کو سند وحجت کا درجہ حاصل ہے اور ایسے تمام اختلافی مسائل جن پر ہندوپاک میں ایک عرصہ سے میدان کارزاراور جنگ وجدل کا اکھاڑہ برپا تھا، آپ نے نہایت مدلل ومحقق انداز میں مبرہن فرمادیا۔ بلاشبہ امام اہل سنت نوراللہ مرقدہ دین و مذہب اور مسلک کے معاملہ میں مضبوط ومتصلب ضرور تھے، لیکن متعصب نہیں تھے۔ یہی وہ اعتدال تھا جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو عزیز جہاں بنادیا تھا، اپنے تو اپنے پرائے اور مخالف بھی آپ کی عظمت کے قائل تھے۔ بہت کم لوگوں کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہوگا کہ جس نے قریب قریب تمام فروعی مسائل اور فرق باطلہ کی تردید میں مدلل و محقق انداز میں لکھا ہو، اوران کی کھل کر تردید کی ہو، مگراس کے باوجود اسے ہر فرقہ کے لوگ بلکہ عوام وخواص اور جاہل وعالم، عظمت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔

کبھی کبھی کسی موضوع پر آپ سے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، علامہ بنوری اور مفتی محمود (رحمہم اللہ) کتاب لکھنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مدنی، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق حقانی، حضرت قاری محمد طیب، امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، حافظ حدیث مولانا عبداللہ درخواستی، شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری، محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، علامہ خیر محمد جالندھری، علامہ شمس الحق افغانی، مفتی سید مہدی حسن، شیخ الحدیث مولانا محمد عبدالرحمٰن کیملپوری وغیرہ اکابر حضرات نے آپ کی تحریروں کی تعریف کی ہے اور ان پر اپنی گراں قدر تصدیقات ثبت کی ہیں۔

تصنیفات کی فہرست

ذیل میں حضرت مولانا سرفراز صفدر خانؒ کی تصنیفات کی ایک فہرست پیش کی جارہی ہے:

(۱) تفسیر قرآن (آٹھ جلدیں) (۲) خزائن السنن: دوجلدوں میں جامع ترمذی کی شرح (۳) احسن الباری (۴) گلدستۂ توحید (۵) راہ سنت (۶) تبرید النواظر (آنکھوں کی ٹھنڈک)، (۷) تفریح الخواطر (حاضر وناظر) (۸) دل کا سرور (۹) تنقید متین بر تفسیر نعیم (۱۰) مسئلۂ نور و بشر (۱۱) عبارات اکابر (۱۲) تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور (۱۳) احسن

الکلام مسئلہ فاتحہ خلف الامام (۱۴) الکلام المفید فی اثبات التقلید (۱۵) طائفۂ منصورہ (۱۶) ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب (۱۷) آئینہ محمدی (۱۸) درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ (۱۹) چہل مسئلہ حضرات بریلویہ (۲۰) اظہار الغیب فی کتاب اثبات علم الغیب (۲۱) ملاعلی قاری اور مسئلۂ علم غیب (۲۲) المسلک المنصور (۲۳) اتمام البرہان فی ردتوضیح البیان (چار جلدیں) (۲۴) عمدۃ الاثاث (طلاق ثلاث) (۲۵) مقام ابی حنیفہؒ (۲۶) الشہاب المبین (سماع موتی) (۲۷) سماع موتی (۲۸) ینابیع (تراویح) (۲۹) ہدایۃ المرتاب الی طریق الثواب فی تحقیق المعجزات (۳۰) ضوء السراج فی تحقیق المعراج (۳۱) اطیب الکلام (۳۲) الکلام الحاوی فی تحقیق عبارۃ الطحاوی (۳۳) حکم ذکر بالجہر (۳۴) اخفاء الذکر (۳۵) ارشاد الشیعۃ (۳۶) عیسائیت کا پس منظر (۳۷) توضیح المرام فی نزول المسیح (۳۸) مقالہ ختم نبوت (۳۹) مرزائی کا جنازہ اور مسلمان (۴۰) صرف ایک اسلام (منکر حدیث غلام جیلانی برق کی کتاب 'دو اسلام' کے رد میں) (۴۱) انکار حدیث کے نتائج (۴۲) شوق حدیث (۴۳) مودودی کا غلط فتوی (۴۴) تبلیغ اسلام (۴۵) بانی دارالعلوم دیوبند (۴۶) باب جنت (۴۷) چالیس دعائیں (۴۸) مسئلۂ قربانی (۴۹) حلیۃ المسلمین (داڑھی) (۵۰) شوق جہاد (۵۱) راہ ہدایت (۵۲) خطبات امام اہل سنت (تین جلدیں) وغیرہ

امام اہل سنت قدس سرہ کی جملہ کتابیں خصوصاً عقائد وایمانیات سے متعلق تحریریں نہایت ہی ایمان افروز اور بصیرت افزا ہیں۔ ان کتابوں نے بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار ڈانواں ڈول افراد کو شکوک و شبہات سے بچایا اور ان کے دین وایمان کا تحفظ کیا۔

وفات

۹۵؍سال کی طویل عمر گزارنے کے بعد آپ ۵؍مئی ۲۰۰۹ء مطابق ۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ پیر اور منگل کی درمیانی شب کو دو بجے اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ جنازے میں دو لاکھ سے زیادہ سوگوار فرزندان توحید نے شرکت کی اور اس عالم ربانی، محقق دوران اور شیخ وقت کو سپرد خاک کیا۔ اللّٰھم اغفرہ وارحمہ وارفع درجاتہ فی جنات النعیم!

نوٹ: مضمون کی تیاری میں درج ذیل مضامین وتحریرات سے مدد لی گئی:

(۱) مختصر آپ بیتی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ

(۲) http://deoband.org/2009/05/history/biographies-of-scholars/obituary-shaykh-muhammad-sarfaraz-khan-safdar/

ہے تجھ سے دیدۂ مہہ وانجم فروغ گیر

مولانا نصیر احمد خاں صاحب (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم/ دیوبند)

از: فاروق اعظم عاجزؔ قاسمی
شعبہ انگریزی، دارالعلوم دیوبند

نحیف الجثہ، بلند قامت، کشادہ جبیں، سفید بشرہ، نورانی ڈاڑھی، آنکھوں پر موٹا چشمہ، سفید کرتا، سفید پاجامہ، سر پر دو پلی روایتی ٹوپی، ہاتھ میں عصائے پیری، کالی جوتی پہنے ہوئے سر نیچے کرکے صدر دروازے سے ہوکر احاطۂ مولسری کی طرف اس شان وشوکت کے ساتھ آرہے ہیں کہ سیکڑوں پروانے آپ پر نچھاور ہیں۔ یہ ہیں ہم سب کے دل وجان سے عزیز استاذ محترم، بلکہ استاذ الاساتذہ، بہت سے زندہ کرداروں کے عنوان، نمونۂ اسلاف، معلّم، مصلح مخلص، شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب۔

حضرت شیخ علم وعمل کا پیکر اور اخلاق وکردار کا مجسمہ ہیں، اپنے ہزاروں شاگردوں میں بدر کامل، صلاح وتقویٰ میں نمایاں، عادات واطوار میں منفرد اور بے شمار اوصاف وکمالات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

انگریزی فوج کے اعلیٰ منصب پر فائز، علما نواز اور مولانا خلیل احمد امبہٹویؒ کے مرید جناب عبدالشکور صاحب کے گھر ۱۳۳۵ھ میں حضرت نے آنکھیں کھولیں۔ حضرت کے والد ماجد کے دینی جذبہ کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے ''ترک موالات'' کے اعلان کے بعد وہ انگریزی ملازمت کو خیر باد کہہ کر کاشتکاری میں لگ گئے۔ حضرت شیخ کا آبائی وطن قصبہ ''بسی'' ضلع بلند شہر (یوپی) ہے؛ لیکن موجودہ رہائش دیوبند میں ہے۔

والدہ بھی انتہائی پارسا اور عبادت گزار تھیں، بچیوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنا اور اخلاقی تربیت کی فکر ان کے شب وروز کا مشغلہ تھا، تلاوت قرآن سے شغف کا یہ حال تھا کہ حافظہ نہ ہونے

کے باوجود بچیوں کو غلطیوں پر بے ساختہ ٹوکتیں۔

حضرت شیخ کے بڑے بھائی مولانا بشیر احمد خاں صاحبؒ چوں کہ مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں مدرس تھے اس لیے ان کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوا۔ حفظ قرآن اس کے بعد عربی و فارسی کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ ساتھ بخاری تک کی مکمل تعلیم اپنے بڑے بھائی سے اسی گہوارۂ علم میں حاصل کی۔ درمیان میں کچھ خانگی الجھنوں کی وجہ سے ایک مرتبہ حضرت شیخ کا تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا؛ لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی نظرِ عنایت اور دعاؤں کے خاص اثر سے رکاوٹ ختم ہوئی اور تعلیمی مرحلہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۱۳۶۲ھ میں جب مولانا بشیر احمد خاں صاحب بحیثیت مدرس دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو حضرت شیخ بھی برادر محترم کے ہمراہ آئے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا اعزاز علیؒ، مولانا بشیر احمد خاںؒ اور مولانا عبدالحقؒ اکوڑہ خٹک (پاکستان) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرکے ۱۳۶۳ھ میں از سر نو دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی اور ۱۳۶۵ھ تک حضرت نے تفسیر و قرأت، فقہ و اصول فقہ، منطق و فلسفہ اور طب و حکمت جیسے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں اور ان میں تخصص پیدا کیا۔ فن قرأت میں تو ایسی مہارت پیدا کی کہ فراغت کے بعد ہی ملتان کے ایک بڑے مدرسہ میں صدر القراء کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوگیا؛ لیکن اہل خانہ کی عدم رضامندی کی بنا پر وہاں نہیں جاسکے؛ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند میں خدمت مقدر تھی۔

چوں کہ حضرت مدنیؒ کی خاص توجہ حضرت شیخ پر مرکوز تھی اس لیے انھیں کی کوشش سے ۱۳۶۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں آپ کا بحیثیت مدرس تقرر ہوا۔ میزان سے اس سلسلے کا آغاز ہوا اور تدریس کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے وہ متوسط درجہ سے علیا اولیٰ پھر علیا ثانیہ کے استاذ مقرر ہوئے، اس دوران درس نظامی کے ہر فن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھائیں، صرف ونحو ہو یا ادب ولغت یا پھر تفسیر وفقہ۔

۱۳۹۱ھ سے درس حدیث کا آغاز ہوا اور ۱۳۹۷ھ تک حدیث کی معروف معتبر کتابیں: موطا امام مالک، طحاوی، ترمذی اور مسلم وغیرہ آپ کے زیر درس رہیں۔ ۱۳۹۷ھ میں خدائے عزوجل نے حضرت شیخ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف پڑھانے کی صورت میں شیخ الحدیث کا بلند مقام عطا کیا اور یہ سنہرا سلسلہ انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ ایک سال پہلے تک جاری رہا، اپنی پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کی بنا پر صفر ۱۴۲۹ھ کو دارالعلوم دیوبند سے سبک دوش ہوئے۔

ویسے تو حضرت شیخ نے اپنے تدریسی دور میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں اور پڑھانے؛ بلکہ درس کی مقبولیت میں صلاحیت واستعداد کی کس قدر ضرورت ہوتی اوراس کا کیا رول رہتا ہے، اہل نظر جانتے ہیں۔فن میں ان کی حذاقت ہی کی بات ہے کہ دیگر درسگاہوں کے مقابلے میں آپ کی درسگاہ طالبانِ علوم سے بھری رہتی۔

حضرت کو معقول ومنقول دونوں میں کامل دسترس حاصل ہے۔مولانا نورعالم خلیل امینی لکھتے ہیں:''(وہ) معقول ومنقول دونوں میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں؛ بلکہ دارالعلوم میں علوم عقلیہ کے ماہرین کی اس وقت آخری کڑی ہیں۔''(وہ کوہ کن کی بات...ص ۳۳۶)

صرف ونحو، ادب و بلاغت اورتفسیر وحدیث کے ساتھ ساتھ علم ہیئت بھی حضرت شیخ کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے، اس فن کی ''التصریح'' نامی کتاب مستقل آپ کے زیرِ درس رہتی، اس فن میں حضرت کو بڑا کمال حاصل تھا پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو طلبہ کے ذہن میں اتار دیتے اور طلبہ بھی بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتے اور بڑی تعداد میں شریک درس ہوتے۔

دارالعلوم کے تدریسی عہد میں درس وتدریس کے علاوہ کئی اہم ذمہ داریاں بھی حضرت کے سپرد رہیں۔حضرت شیخ کی علمی استعداد اورانتظامی صلاحیت کے پیش نظر ۱۳۹۱ھ میں اہتمام کی نیابت سپرد ہوئی، ۱۳۹۷ھ میں شیخ الحدیث کے عظیم منصب پر فائز ہوئے۔۱۴۰۰ھ میں قائم مقام صدر مدرس منتخب ہوئے اور ۱۴۱۲ھ میں تدریس کی صدارت تفویض ہوئی۔اس طرح سے دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ کی ۶۵/سالہ علمی خدمات کا سنہرا دور پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ ۱۶/سال تک مسند صدارت پر رونق افروز رہے اور ۳۲/سال تک بخاری شریف کا مقدس درس دیا۔ایک مرتبہ حضرت نے خود فرمایا کہ ''میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ۶۵/سال دارالعلوم دیوبند میں خدمت کا موقع دیا،۳۲ سال بخاری پڑھائی، بھائی! دعا کرو کہ بس ایمان پر خاتمہ ہو۔''

حضرت شیخ حسنِ صورت وحسنِ سیرت کے ساتھ ساتھ حسن صوت بھی رکھتے ہیں۔کلام انتہائی عام فہم اور سادہ ہونے کے ساتھ فصاحت وبلاغت سے بھرپور ہوتا، گفتگو انتہائی صاف ستھری، واضح اور نکھری ہوئی ہوتی، خوش آوازی میں بھی دور دور تک ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا، انداز نہایت شیریں، مثبت، متین اور سنجیدہ ہوتا، لہجہ عالمانہ اور رفتارِ گفتگو معتدل کہ نہ تو کسی پر بار گزرے اور نہ الجھن محسوس ہو اور نہ ہی کسی کی زبان پر سمجھ میں نہ آنے کا شکوہ؛ بلکہ جوں جوں درس

شباب پر آتا طالبان علوم کی اضطرابی کیفیت میں اضافہ اور تشنگی مزید بڑھتی چلی جاتی، بلندیٔ آواز کا یہ عالم کہ بلامبالغہ بغیر مائک کے بآسانی پوری دارالحدیث ان کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھتی؛ بلکہ آج بھی جب کہ وہ اپنی زندگی کی ۹۵ ویں بہار میں ہیں اور چلنے پھرنے سے معذور ہیں، آواز میں وہی بلندی، وہی کرختگی، وہی شفافیت اور وہی دلکشی باقی ہے۔

حضرت شیخ کے طریقۂ درس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سال کے ابتدائی ایام میں حدیث پر تفصیلی گفتگو کرتے، کلام انتہائی جامع مانع ہوتا، امام بخاری حدیث کے تحت جو بات قائم کرتے ہیں اس کو انتہائی پیچیدہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شیخ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ امام بخاری کے مقصد کو بھی سمجھاتے چلے جاتے، اس سلسلے میں بخاری کا اسلوب کیا ہے؟ اس کی بھی وضاحت فرماتے اور مکمل ہنرمندی کے ساتھ حدیث، اس کا مفہوم، اس سے ملنے والا پیغام، اس پر عمل کرنے کی تاکید اور اس پر ملنے والے ثمرات کو تشنہ کامان علوم کے ذہن ودماغ میں پیوست کردیتے۔ تقریباً دو مہینے کے بعد کلام مختصر کردیتے انداز وہی رہتا؛ لیکن ششماہی بعد سے کلام کا سلسلہ انتہائی مختصر ہوجاتا اور حدیث خوانی ہوتی۔

حضرت شیخ کی ہمت کہیے یا حدیث پاک کی برکت کہ دوران درس حضرت بسا اوقات تین تین چار چار گھنٹے درس دیتے رہتے لیکن نہ ہلنا ہے نہ جھکنا اور نہ ہی کسی قسم کا تکیہ؛ بس پالتی مار کر پورے جاہ وجلال کے ساتھ مسند حدیث پر جلوہ افروز، پشت بالکل سیدھی ہے اور داہنا ہاتھ کتاب پر، از اوّل تا آخر ایک ہی نشست ہوتی۔ بیچ بیچ میں ''بھئی امام بخاری فرماتے ہیں''، عبارت خواہ کو ''پڑھیے''، ''وغیرہ وغیرہ'' اور اختلافی روایات کے وقت ''عندالبعض'' کے باربار دہرانے کا انوکھا انداز اپنے اندر بڑی دلآویزی رکھتا اور حضرت شیخ کی یہ ادا ہم شاگردان کے دلوں کو موہ لیتی اور ہم جھوم جھوم اٹھتے۔

ایک طرف جہاں خواص نے باضابطہ طور پر ان سے حدیث وتفسیر کے علوم سے اپنی پیاس بجھائی تو دوسری طرف حضرت نے عوام کو بھی اپنے فیوض سے محروم نہیں رکھا، چناں چہ تمل ناڈو کے ''کوئمبٹور'' علاقے کی اول ''تاگہ'' محلّہ کی مسجد پھر ٹیپو سلطان مسجد میں تقریباً چالیس سال تک تفسیری خدمات انجام دیں جس سے بہت سے بے راہوں کو راہ اور منزل کا پتہ ملا اور دینداری کی فضا قائم ہوئی۔ خرابیٔ صحت اور ضعف کی وجہ سے چند سال قبل یہ سلسلہ منقطع ہوا۔

تصنیف وتالیف بھی ایک مستقل چیز ہے، ہر کسی کا یہ مقدر بن جائے ضروری نہیں، لہٰذا:

حضرت شیخ کی کوئی تصنیف تو نہیں ہے؛ لیکن حضرت والا کے دامنِ فیض سے فیضیاب ہونے والے صرف حدیث کے کم وبیش پچیس ہزار شاگرد ہیں، ان میں سے بے شمار ایسے ہیں جنھوں نے علمی، اصلاحی، تحقیقی اور تصنیفی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور دے رہے ہیں، موجودہ اساتذۂ دارالعلوم بھی تقریباً ان کے شاگرد ہیں۔ اس طرح سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بے شمار مدارس اور دینی اداروں میں حضرت کا فیض جاری وساری ہے۔

چوں کہ حضرت شیخ کو فن ہیئت سے بڑی دلچسپی رہی ہے؛ اس لیے اس حوالہ سے بھی ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ ابھی چند سالوں پہلے حضرت کے ایک خاص شاگرد مولانا ثمیر الدین قاسمی (مقیم حال لندن) نے طلوع وغروب کے متعلق ایک عمدہ کتاب تصنیف کی ہے۔ جس سے دنیا بھر کے طلوع وغروب کے اوقات کی تعیین ہوتی ہے اور ساتھ ہی رویت ہلال کے چند قابل ذکر مسائل کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ اہل تحقیق وجستجو کے لیے خاصے کی چیز اور نادر تحفہ ہے۔

حضرت شیخ کے کل دس اولاد ہوئیں۔ تین اللہ کو پیارے ہوچکے اور سات بفضل اللہ بقید حیات ہیں۔ ماشاء اللہ اولاد کی اولاد سے گھر ہرا بھرا ہے، ان میں سے کئی برسرِ روزگار ہیں اور بعض زیر تعلیم اور اپنے دادا محترم کی خدمت کرکے خوب خوب آخرت کمارہے ہیں۔

حضرت شیخ کو اپنے استاذ وشیخ حضرت مدنیؒ سے کس قدر دلی لگاؤ اور سچی عقیدت ہے اس کا صحیح اندازہ حضرت کا کوئی شاگرد ہی کرسکتا ہے۔ دارالحدیث کے درودیوار اس منظر کے گواہ ہیں کہ جب بھی وہ حضرت مدنیؒ کا تذکرہ کرتے تو آب دیدہ ہوہوجاتے بلکہ کبھی کبھی بولتے بولتے زبان بند ہوجاتی۔ اس تعلق خاطر کی بنا پر مولانا نصیر احمد خاں صاحب کا اصلاحی تعلق بھی حضرت مدنی ہی سے رہا اور انھیں سے بیعت بھی تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، یہاں تک کہ بیعت کے ساتھ ساتھ خلعتِ خلافت سے بھی نوازے گئے؛ لیکن خود کبھی کسی کو انھوں نے بیعت نہیں کیا اور ہمیشہ بے نفسی اور گمنامی والی زندگی کو ترجیح دی اور خود فرماتے کہ: ''بھئی میرا مزاج نہیں، یہ تو بڑے حضرات کی چیزیں ہیں۔''

علم وعمل کے ساتھ ساتھ خدا نے حضرت کو بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے۔ ان کی رفتارو گفتار سے سنت کے عملی نمونہ کا اظہار ہوتا ہے، صلاح وتقویٰ کے ساتھ نرم مزاجی، خوش اخلاقی اور تواضع ان کا طرۂ امتیاز ہے، ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے بطور خاص محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے ہیں؛ یہی وہ خوبیاں ہیں جو حضرت کو مقبولیت و

محبوبیت کا اعلیٰ مقام عطا کرتی ہیں۔

معروف ادیب مولانا نورعالم خلیل امینی صاحب رقم طراز ہیں: ''تواضع، حلم وبردباری، نرم خوئی، خوش اخلاقی، صلاح وتقویٰ وغیرہ صفات کی وجہ سے آپ طلبہ، اساتذہ، ملازمین اور تمام متعلقین دارالعلوم میں محبوب شخصیت کے مالک ہیں''۔ (وہ کوہ کن کی بات، ص ۳۳۶)

ان کی تواضع کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان سے کبھی کوئی چوک یا غلطی ہوجاتی ہے اور اس پر ان کو واقفیت بھی ہوجاتی ہے تو برملا حضرت اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں؛ بلکہ بعض مرتبہ کبھی کسی بات پر اپنے کسی شاگرد کو ڈانٹ دیتے تو دوسرے وقت میں بلاتأمل معذرت خواہی بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا دل اہل علم کی عظمتوں سے بھی لبریز دکھائی دیتا ہے۔ اساتذہ کو بھی برابر اپنی عقیدت ومحبت کا خراج پیش کرتے اور بلک اٹھتے۔ اسی طرح جب بھی دعا کا کوئی موقع آتا تو ''آپاجی'' (والدہ حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب الحمدللہ ابھی بقید حیات ہیں) کی صحت وعافیت کے لیے ضرور دعا کرتے۔

بھیڑ بھاڑ اور جلسہ جلوس میں بہت کم شریک ہوتے۔ گوشہ نشینی اور گمنامی ان کا امتیاز رہا ہے۔ رات سویرے سونا اور سویرے بیدار ہونا ان کے مستقل معمول میں داخل ہے۔ پچاسوں سال سے تہجد کا سلسلہ اور جہری ذکر کا معمول ہے، روزانہ بعد نماز فجر ایک پارہ تلاوتِ قرآن، اس کے بعد ناشتہ کرکے تدریسی مشغلہ، دوپہر کھانے کے بعد قیلولہ، بعد عصر اپنی بیٹھک میں لوگوں سے ملاقات اور وعظ ونصیحت، صحت کے زمانے تک یہ معمولات زندگی کا اہم حصہ بنے رہے اور ایک حد تک اس کی پابندی بھی؛ لیکن جب حضرت کی صحت گرگئی اور ضعف ونقاہت بڑھتی چلی گئی تو اب اوّل وقت میں بیدار ہوکر اشارے سے نماز فجر ادا کرتے ہیں، اس کے بعد تلاوت، اکثر اوقات آرام فرماتے ہیں؛ لیکن ذکر الٰہی سے زبان ہر دم تروتازہ رہتی ہے، روزانہ بعد نماز ظہر بخاری شریف کے دوصفحات کی تلاوت کا معمول تاہنوز جاری ہے۔

صحت وعافیت کے ساتھ ساتھ اللہ حضرت شیخ کے سایہ کو مزید دراز کرے! (آمین)

❁ ❁ ❁